یہ جہانِ رنگ و بو
(افسانوں کا مجموعہ)
ذکیہ مشہدی

: ذکیہ سلطانہ مشہدی

: ذکیہ مشہدی

: 1944

: ایم اے (سائکولوجی) لکھنؤ یونیورسٹی

:

1. پرائے چہرے (افسانوں کا مجموعہ)
2. تاریک راہوں کے مسافر (افسانوں کا مجموعہ)
3. صدائے بازگشت (افسانوں کا مجموعہ)
4. نقشِ ناتمام (افسانوں کا مجموعہ)
5. یہ جہانِ رنگ و بو (افسانوں کا مجموعہ)

:

تقریباً ایک درجن علمی اور ادبی کتابوں کا ہندی و انگریزی سے اردو اور اردو سے ہندی و انگریزی میں ساہتیہ اکادمی دہلی؛ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، دہلی؛ بیورو فار پروموشن آف اردو دہلی؛ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ؛ کے لئے۔

ں:

تقریباً دو درجن چھوٹی چھوٹی کتابیں کہانیوں کے پیرائے میں نوخواندہ بالغوں کے لئے آسان ہندی و اردو میں۔ اس سلسلے میں صوبائی و مرکزی حکومتوں سے ایوارڈ، بہار گورنمنٹ سے مجموعی ادبی خدمات کے لئے ایوارڈ۔

# یہ جہانِ رنگ و بُو

(افسانوں کا مجموعہ)

ذکیہ مشہدی



ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

**YEH JAHAN-E-RANG-O-BU**

(Short Stories)

by

*Zakia Mashhadi*

F-1, Grand Pallavi Court
Gudga Court- Road, Patna-800004
E-mail: zakia.mashhadi@yahoo.com

Year of Edition 2013
ISBN 978-93-5073-179-6
₹ 200/-

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | یہ جہانِ رنگ و بُو (افسانوں کا مجموعہ) |
| مصنفہ | : | ذکیہ مشہدی |
| سن اشاعت اوّل | : | ۲۰۱۳ء |
| قیمت | : | ۲۰۰ روپے |
| مطبع | : | روشان پرنٹرس، دہلی۔۶ |

*Published by*

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23214465, 23216162, Fax: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

# انتساب

ننھے دانیال

کے نام

اس امید کے ساتھ

کہ وہ بڑا ہو کر اُردو ضرور پڑھے گا

# انتساب

ننھے دانیال

کے نام

اس امید کے ساتھ

کہ وہ بڑا ہو کر اُردو ضرور پڑھے گا

# فہرست



☆☆

# فہرست



☆☆

# افسانوں سے پہلے کچھ

میں فکشن میں مطالعہ خیزی (readability کے لئے مطالعہ خیزی کی اصطلاح مجھے جناب وجاہت علی سندیلوی مرحوم نے دی تھی ) کی سختی سے قائل ہوں۔ پہیلیاں بجھانے، بات کو گھما پھرا کر کہنے اور ادب میں گندگی گھنگولنے سے مجھے سخت چڑ ہے۔ یہاں گندگی گھنگولنے کی وضاحت بھی کردوں۔ اس سے میری مراد فحاشی یا عریانی سے نہیں ہے۔ یہ الگ موضوع ہے اور میں یہاں قطعی اسے نہیں چھو رہی ہوں۔ جہاں ضروری ہو وہاں جنسی معاملات کا تذکرہ گراں نہیں گذرتا۔ منٹو اور عصمت اس کی مثال ہیں۔ گندگی سے میری مراد بلا وجہ ناک، تھوک، فضلہ، مادۂ منویہ، خون، پیپ، انتڑیوں جیسی چیزوں کا بیان ہے۔ یہ گندگی بیشک ہماری زندگی کا حصہ ہے۔ اس لئے ضرورت پڑنے پر اس کا بیان جو متن کا حصہ ہو، برداشت ہو جائے گا۔ لیکن بلا وجہ نہیں اور ذہین قاری بالکل سمجھ لیتا ہے کہ کہاں کوئی چیز پلاٹ اور بیانیہ کا ناگزیر جز ہے اور کہاں لفاظی یا زیب داستاں کے لئے اسے لایا گیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میں بازار سے گذر رہی تھی تو وہاں دو انتہائی غریب اور گندی عورتوں کو ایک مرغ بیچنے والے کی دکان کے سامنے بیٹھے پایا۔ خریدار اندر تھے۔ دکان کے باہر یہ عورتیں پیروں، پنجوں اور اندرونی آلائش کے ڈھیر سے کچھ چن چن کر ایک پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال رہی تھیں۔ بنجارے اکثر کتے پالتے ہیں۔ میں سمجھی انکے پاس کتے ہوں گے اور وہ انکے لئے یہ لے جا رہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ نہ وہ بنجارنیں ہیں نہ ان کے پاس کتے ہیں۔ یہ آنتیں صاف کر کے وہ خود پکا کے کھائیں گی۔ اب اگر میں اس تکلیف دہ غربت کی بات

کروں جو آج کے دور میں ایک صوبائی دارالسلطنت میں غریب عورتوں کو کوڑے کے ڈھیر سے مرغ کی آنتیں چننے پر مجبور کرتی ہے تو یقیناً چند جملے اس غلاظت کو بیان کرنے کے لئے ناگزیر ہوں گے۔

دوسری چیز ہے غیر ضروری علامت نگاری جس نے ابھی تک اردو ادیبوں کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔ منٹو، عصمت، خواجہ عباس، جمیلہ ہاشمی، انتظار حسین، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر اور درجنوں دوسرے (جن کے نام اتنے ہی اہم ہیں لیکن چونکہ مجھے اہم ادیبوں کی فہرست نہیں تیار کرنی اس لئے انہیں چھوڑ رہی ہوں) جنہوں نے اردو ادب کو مالا مال کر دیا ہے نہ پہیلیاں بجھاتے تھے نہ گندگی بکھیرتے تھے۔ کیا بات ہے صاحب، ان کی تخلیقات دو بار، چار بار پڑھئے۔ دل نہیں بھرے گا۔ ہندستان کی دوسری علاقائی زبانوں کے بڑے ادیبوں کو بھی دیکھ لیجئے۔ ابھی میرے سامنے ایس کے پوٹے کاٹ کے ملیالی ناول کا ہندی ترجمہ 'کتھا ایک پرانتر کی' کے عنوان سے پڑا ہوا ہے۔ اسے گیان پیٹھ انعام مل چکا ہے۔ کوئی دس سال پہلے پڑھا تھا۔ اتفاق سے پھر سامنے آ گیا تو دوبارہ پڑھ رہی ہوں۔ کہیں کوئی ٹیڑھی چال نہیں، کہیں ہاتھ گھما کر ناک کو نہیں پکڑا اور بہترین ناول تخلیق کیا ہے۔ بھوتی بھوشن بندو پادھیائے کا 'پتھیر پنچالی'، نہ جانے کتنی بار پڑھا۔ مل جائے تو پھر پڑھ لوں گی۔ صاحب، تاریخ کی کچھ کتابیں ایسی ہیں کہ تاریخ سے دلچسپی نہ ہو تو بھی پڑھتے جائیے۔ یقین نہ آئے تو ولیم ڈالرمپل (William Dalrymple) کی تصنیفات اٹھا لیجئے۔ پھر یہ ہمارے اردو ادیبوں کو کیا ہو گیا ہے۔ آج کل کئی نوجوان اور باصلاحیت لکھنے والے اپنے آپ کو بھول بھلیوں میں گم کر رہے ہیں۔ میں نام لے کر خود کو مصیبت میں نہیں ڈالوں گی۔ کچھ حضرات گفتگو کا موضوع ہیں لیکن نقاد اور کچھ 'غیر معمولی' ذہین حضرات ہی انہیں پسند کر رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ صرف ابن صفی اور ایم اسلم کو پڑھنے والوں کے لئے ادب تخلیق کیجئے۔ لیکن اگر اوسط درجے کا ذہین قاری کانوں کو ہاتھ لگا کر بھاگ جائے تو اردو ادب کہاں جائے گا؟ مطالعہ خیزی کے لئے فکر انگیزی کو قربان نہیں کیا جا سکتا لیکن فکر انگیزی بھی بڑے بڑے حوالے دینے کی محتاج نہیں ہوتی، بھول بھلیوں میں بھٹکاتی نہیں۔ منٹو نے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'

اور 'کھول دو' جیسے بڑے افسانوں میں کون سا فلسفہ چھاتا ؟ قرۃ العین حیدر کی 'جلاوطن اور 'ہاؤسنگ سوسائٹی' جیسی دل ہلا دینے والی طویل مختصر کہانیوں میں کون سے بڑے نام لئے گئے یا پینترے بازی کی گئی ؟ اچھا ادب پڑھنے والے کو ذہنی غذا ہی نہیں مہیا کرتا، اسے فرحت وانبساط سے بھی دوچار کراتا ہے۔ یہ جب ہی ہوگا جب تحریر دلکش اور سلجھی ہوئی ہو۔

کیا میرے قاری بھی بار بار میرے افسانے پڑھیں گے اور میرے ساتھ غمگین ہوں گے، میرے ساتھ خوش ہوں گے، میرے ساتھ اس بے بس غصے کو محسوس کریں گے جو سماجی ناانصافیاں اور ظلم بیدار کرتے ہیں؟ بہر حال اپنے گرد وپیش گھومتے اس جہان رنگ و بو کو اپنی متحیر (اور اب تھکی ہوئی) آنکھوں سے دیکھتی ہوں اور جو دیکھتی ہوں اسے لوگوں کو کہانی کی صورت میں سنانا چاہتی ہوں۔

میرے پاس بہت سی کہانیاں ہیں لیکن ٹی وی، کمپیوٹر اور موبائل کے اس دور میں کتابوں کے لئے لوگوں کے پاس وقت کم ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ صفحات دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگائیں۔ صرف چودہ افسانوں پر اکتفا کی۔ امید ہے یہ پسند کیے جائیں گے۔ ان میں فاختہ، مچھندر کی واپسی اور انگوٹھی تین افسانے ایسے ہیں جو ابھی کہیں شائع نہیں ہوئے ہیں باقی مختلف معیاری ادبی رسالوں میں شائع ہو کر مجھے مثبت ردعمل دے چکے ہیں۔

ذکیہ مشہدی

☆☆

اور 'کھول دو' جیسے بڑے افسانوں میں کون سا فلسفہ چھانٹا؟ قرۃ العین حیدر کی 'جلاوطن' اَور 'ہاؤسنگ سوسائٹی' جیسی دل ہلا دینے والی طویل مختصر کہانیوں میں کون سے بڑے نام لیے گئے یا پینترے بازی کی گئی؟ اچھا ادب پڑھنے والے کو ذہنی غذا ہی نہیں مہیا کرتا، اسے فرحت وانبساط سے بھی دوچار کراتا ہے۔ یہ جب ہی ہوگا جب تحریر دلکش اور سلجھی ہوئی ہو۔

کیا میرے قاری بھی بار بار میرے افسانے پڑھیں گے اور میرے ساتھ غمگین ہوں گے، میرے ساتھ خوش ہوں گے، میرے ساتھ اس بے بس غصے کو محسوس کریں گے جو سماجی ناانصافیاں اور ظلم بیدار کرتے ہیں؟ بہر حال اپنے گردوپیش گھومتے اس جہان رنگ و بو کو اپنی متحیر (اور اب تھکی ہوئی) آنکھوں سے دیکھتی ہوں اور جو دیکھتی ہوں اسے لوگوں کو کہانی کی صورت میں سنانا چاہتی ہوں۔

میرے پاس بہت سی کہانیاں ہیں لیکن ٹی وی، کمپیوٹر اور موبائل کے اس دور میں کتابوں کے لئے لوگوں کے پاس وقت کم ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ صفحات دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگائیں۔ صرف چودہ افسانوں پر اکتفا کی۔ امید ہے یہ پسند کیے جائیں گے۔ ان میں فاختہ، مچھندر کی واپسی اور انگوٹھی تین افسانے ایسے ہیں جو ابھی کہیں شائع نہیں ہوئے ہیں باقی مختلف معیاری ادبی رسالوں میں شائع ہو کر مجھے مثبت ردعمل دے چکے ہیں۔

ذکیہ مشہدی

☆☆

# ماں

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہڈیوں کے آر پار ہو گیا

کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا اس پر مہاوٹیں بھی برسنے لگیں۔ پتلی ساری کو شانوں کے گرد کس کر لپیٹتے ہوئے منی کو خیال آیا کہ اوسارے میں ٹاپے کے نیچے اس کی چاروں مرغیاں، جو دبک کر بیٹھی ہوئی ہوں گی، ان پر ٹاپے کے سانکوں سے پھوار پڑ رہی ہوگی۔ بیمار پڑ کر مر گئیں تو دوبارہ خریدنا بہت مشکل ہوگا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے ٹٹر ہٹایا اور باہر آ گئی۔ بارش نے جیسے ہر طرف باریک ململ کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ سورج پہلے ہی کئی دن سے نہیں نکلا تھا۔ اس پر یہ چادر۔ پھر اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ دن تاریخ مہینہ تو ویسے بھی اسے کم ہی یاد رہا کرتے تھے اب صبح شام بھی بھول چلی تھی کیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ سورج نکلا بھی ہوتا تو کیا اب تک بیٹھا رہتا۔ رات تو آ ہی گئی تھی۔ ہاں پہلے ہی پہر ایسی اندھیری اور اداس نہ ہوتی شاید۔ اس نے ٹاپا اٹھا کر مرغیوں کو دبوچا۔ ڈرے سہمے پرندوں نے کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ بازو میں چاروں مرغیاں اور بغل میں ٹاپہ دبا کر وہ مڑ ہی رہی تھی کہ اچانک دور پھوار اور اندھیرے کے دوہرے پردے کے پیچھے سے کوئی ہیولی ابھرتا محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چنگاری سی بھی چمکی ذرا سی دیر کو اسے لگا اگیا بیتال ہے۔ لیکن اگیا بیتال ہندو ہوا تو مرگھٹ میں اور مسلمان ہوا تو قبرستان میں آنکھیں مٹکاتا، لوگوں کو راستہ بھلاتا گھومتا ہے۔ زندوں کی بستی میں اس کا کیا کام۔ وہاں اپنے اگیا بیتال بہتیرے ہیں۔ منی ڈری نہیں اور ڈرتی وہ تھی بھی نہیں۔ رات کے سناٹے

میں ہر ہر کرتی گنگا کے درمیان پھیلے پڑے ڈیرا کے اس علاقے میں وہ تنہا زندگی گذار رہی تھی اور لوگ رہتے تو تھے لیکن جھونپڑیاں دور دور تھیں۔ درمیان میں کھیت تھے یا سبزیوں کے وسیع و عریض قطعے۔ شام پڑے سیار ہواں ہواں کرتے۔ مرغیوں کے فراق میں لومڑیاں دروازے پر قصر پسر کرتیں۔ کبھی آنگن میں لگے امرود کے درخت سے سل سل کرتا، ہرا ہرا سانپ رسی کی طرح نیچے تک آتا اور گردن اٹھا کر اپنی ننھی، چمکیلی، بس بھری آنکھیں منی کی آنکھوں میں ڈال کر اسے گھورتا لیکن ڈرانے میں کامیاب نہ ہوتا۔ وہ پاس پڑی لکڑی اٹھا کر اسے دھمکاتی، ارے اب کیا لے جائے گا رے؟ ہرسیا سے زیادہ زہر ہے کیا تجھ میں؟ منی کے حساب سے اس کا آٹھ سالہ پولیو زدہ لڑکا اور پانچ پانچ سال کی دونوں جڑواں، مریل لڑکیاں سانپ کے کسی کام کے نہ تھے۔ تینوں بچوں کو چوزوں کی طرح اپنے پروں تلے دبا کے وہ بڑی طمانیت سے اپنی اور ان کی روزی روٹی کی فکر میں گھومتی رہتی۔

صبح چار بجے، تڑکے جب سورج نکلا بھی نہ ہوتا اور گرمیوں میں سرکتی رات کے ملگجے اندھیرے یا جاڑوں میں کہرے کی دبیز چادر میں لپٹی پڑی گنگا سوئی ہوئی ہوتی، مچھوارے اپنا اپنا جال نکال لیتے تھے اور ان کی ناویں تڑپتی مچھلیوں سے بھر جایا کرتی تھیں تب اور لوگوں کے ساتھ منی بھی اپنا ٹوکرا لئے پہنچتی اور مچھیاں بھر کر حساب چکتا کرتے، آٹھ بجتے بجتے پار جانے والی پہلی ناؤ پکڑ کر شہر پہنچ جاتی۔ سر پر ٹوکرا اٹھائے محلے محلے مچھلی بیچ کر کوئی دو ڈھائی بجے تک لوٹ آتی۔ راستے سے ضرورت کا سودا سلف بھی اٹھا لیتی۔ کبھی کبھار ایک آدھ مچھلی بچ جایا کرتی تھی۔ منافع ہو نہ ہو، جمع نکل آئے یہ سوچ کر وہ اکثر بچی ہوئی مچھلی بہت کم داموں میں ہرسیا کو بیچ دیا کرتی تھی۔ گھاٹ سے اترتے ہی ہرسیا کا چائے کا کھوکھا تھا۔ وہ آتے جاتے اسے چھیڑتا۔ مفت کی چائے آفر کرتا لیکن مچھلی کے دام اس نے کبھی پورے نہیں لگائے۔ جانتا تھا مچھلی ٹکنے والی چیز نہیں اور منی جیسے غریب بیوپاری میں نقصان اٹھانے کا بوتا نہیں ہوتا۔ چائے کے کھوکھے کی آڑ میں کچی شراب کے ساتھ تلی مچھلی بیچنے والا وہ ان پڑھ کسی ملٹی نیشنل کمپنی کے بزنس اگزیکیٹو سے کم سیانا نہیں تھا۔

منی ذات کی ملاح نہیں تھی لیکن پچھلے بارہ تیرہ سال سے ڈیرا میں ہی اس

جھونپڑی میں رہنے اور شوہر کے موٹر بوٹ چلانے کے پیشے کی وجہ سے وہ گنگا اور گنگا میں بسی مچھلیوں کے علاوہ اور کسی چیز کو نہیں جانتی تھی۔ پندرہویں برس میں وہ بیاہ کر یہاں آئی تھی۔ اسے گنگاماں سے پہلے ہی بڑی عقیدت اور محبت تھی ان کے آنچل میں رہنے کو ملے گا یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا اور اب تو روزی روٹی کا ذریعہ بھی گنگاماں ہی تھی۔ ادھر اس نے بڑی مشکل سے کچھ پیسے بچا کر مرغیاں خریدی تھیں کہ بچوں کو انڈے کھلا سکے۔ اس کا پہلوٹھی کا لڑکا صرف اس لئے مر گیا تھا کہ اسے دوا کے ساتھ اچھی غذا بھی چاہیے تھی۔ اس کی یاد آتی تو کلیجے میں ہوک اٹھتی شادی کے پہلے سال ہی پیدا ہو گیا تھا۔ زندہ ہوتا تو آج کتنا بڑا سہارا ہوتا گیارہ بارہ برس کا وہ بیٹا۔

سرد ہوا کے برے نے ہڈیوں میں چھید بنائے منّی کو محسوس ہوا جیسے اسے بخار چڑھ رہا ہو لیکن تجسس ٹھنڈ پر حاوی ہو گیا۔ اس سن سن کرتے دیرا میں جہاں گنگا کو چھو کر آتی یخ بستہ ہواؤں کے بیچ سیار بھی ہواں ہواں بھول کر ماندوں میں دبک گئے تھے یہ کون تھا جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا آرہا تھا۔

ایک چنگاری پھر چھوٹی "منی او منی" قریب آتی روشنی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ وہ ہڑبڑا گئی۔ سردی، بغل میں دبے ٹاپے، اور دوسرے بازو میں سمٹی مرغیوں کو یکسر بھول کر وہ باہر نکل آئی اور انہیں دیکھ کر تو بالکل ہی ہکا بکا رہ گئی۔

"آپ؟ اس وقت یہاں؟ اندر آجایئے مالک۔ بڑی ٹھنڈ ہے۔"

لانبے قد اور دبلے پتلے جسم پر انہوں نے حسب دستور دھوتی لپیٹ رکھی تھی۔ ہاں پتلے کرتے کی جگہ گاڑھے کی موٹی، پوری آستینوں والی قمیص تھی اور سر پر انگوچھا لپٹا تھا بس یہی ان کی جڑاول تھی (اور گاؤں میں اس سے زیادہ جڑاول بہت سے لوگوں کے پاس نہیں تھی)

"اوسارے میں رات کاٹنے کی اجازت چاہیے منی۔ صبح نکل لوں گا۔ وہ مسکرائے لیکن آواز میں مسکراہٹ کی نہیں بلکہ بجتے دانتوں کی آہٹ تھی۔

"اندر آجایئے مالک"

"اندر؟" وہ ذرا سا ہچکچائے۔

''ہاں مالک۔ یہاں اوسارے میں تو بڑی ہوا ہے۔''

وہ پیچھے پیچھے چل پڑے تو منی کو محسوس ہوا اس کے گھر میں فرشتوں کے قدم اترے ہیں یا گنگا ماں ایک انسان کی شکل اختیار کر کے اس کی جھونپڑی میں آن اتری ہیں زہے نصیب۔ اس نے ٹاپا ایک کونے میں رکھ کر مرغیوں کو جلدی جلدی اس کے نیچے دھکیلا اور بوری سے امرود کی خشک ٹہنیاں اپلے اور کچھ پتے نکالنے لگی۔

''کچھ اور مت کرو منی۔ بس رات کے لئے چھت چاہئے تھی۔ اب اور نہیں چلا جا رہا تھا۔'' وہ بے حد تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ انہوں نے کندھے سے لٹکا جھولا اتارا، ٹارچ اس میں رکھی اور وہیں مٹی کے فرش پر کٹے درخت سے، دھپ سے بیٹھ گئے۔

''آپ کچھ مت بولئے۔'' منی کا جی بھر آیا۔ ''ہمارے پاس جو ہے وہی تو دے سکیں گے۔ نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔'' اس نے اتنی سادگی سے کہا کہ وہ خاموش ہو گئے۔

''مالک کپڑے بھیگ گئے ہیں'' کچھ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ہی اس نے کہا۔ اس کی پشت ان کی طرف تھی۔

منی کے پاس کپڑے کہاں ہوں گے جو وہ بدل سکیں۔ اس لئے انہوں نے اس کی بات ان سنی کر دی حالانکہ اس وقت خشک کپڑوں، خشک جسم اور ہوا سے محفوظ خشک جگہ سے زیادہ ایسا کچھ نہ تھا جسے جنت کا نام دیا جا سکے۔ (ہر شخص کی جنت اس کی اپنی ہوتی ہے اور موقع محل کے اعتبار سے ہوتی ہے شاید۔)

''میرے پاس میرے پتی کی ایک دھوتی رکھی ہوئی ہے۔'' ان کی خاموشی کا مطلب بھانپ کر اس نے کہا۔ ''تب تو ٹھیک ہے۔ صبح تک میرے کپڑے سوکھ گئے تو اسے چھوڑ جاؤں گا۔'' انہوں نے رضامندی ظاہر کی۔ منی خوش ہو گئی۔ اس نے گھر کے واحد کمرے کی کارنس پر رکھا ٹین کا بکسا اتارا۔ یہ بکسا اس کا شوہر پٹنہ کے سوموار ی میلے سے لایا تھا اور اس میں رکھ کر لایا تھا اس کے لئے لال پھولوں والی ساڑی۔ منی اب لال پھولوں والی ساڑی نہیں پہنتی تھی۔ اسے شوہر کی واحد دھوتی کے ساتھ سنبھال کر رکھ دیا تھا۔ اسے تو وہی پہنے گی۔ لنگڑے سے شادی کرنے والی اس کی بہو۔ وہی اس کی اصل

حقدار ہو گی۔

اس نے جلدی سے دھوتی نکالی مبادئی وہ اپنا ارادہ نہ بدل دیں۔ دھوتی انہیں تھما کر وہ پھر اندر چلی گئی۔ گیلے کپڑے اتار کر انہوں نے الگ رکھے۔ خشک دھوتی آدھی باندھ کر آدھی کو اوپر کے جسم پر اوڑھ لیا اب وہ ایک بودھ بھکشو جیسے نظر آرہے ہوں گے۔ سوچ کر ان کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ گاڑھے کی دھوتی نے بڑی راحت پہنچائی۔ گیلے کپڑوں سے نجات پا کر اسے پہننے کا سکھ الفاظ سے پرے تھا۔

"خدا اس نیک دل عورت کا بھلا کرے۔" انہوں نے دل ہی دل میں دعا کی۔

دعا تو ان کے جھولے میں سب کے لئے تھی اور محبت بھی لیکن نہ سب کا پیٹ بھر پاتا نہ بیماریاں دور ہوتیں۔ نہ منی کے شوہر کی واپسی ہو پاتی جسے پولس پکڑ لے گئی تھی کسی کی اس مخبری پر کہ وہ نیپال سے کتھے کی اسمگلنگ میں شامل ہے۔ واپسی تو بڑی بات ساڑھے پانچ سال کا طویل وقفہ گذر جانے کے بعد یہ تک پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ کہاں ہے کس حال میں ہے، ہے بھی یا نہیں ہے۔ منی کبھی بھول سکتی ہے کیا انہوں نے کس طرح سال ڈیڑھ برس تک اس کے شوہر کا پتہ لگانے اور اسے چھڑوانے کے لئے دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا تھا۔ آخر منی نے ہی ان سے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا" بھگون! اب ہم نے صبر کر لیا۔ آپ بھی چھوڑ دیجئے۔ ہمارے بھاگ میں سہاگ ہوگا تو وہ خود آ جائیں گے۔ کہیں جو ودھاتا نے ہی ہمارا سندور پونچھ دیا ہوگا تو کوئی کیا کرے گا۔"

شوہر کی گرفتاری کے پہلے سے ہی اس کا پہلوٹھی کا بیٹا بیمار رہا کرتا تھا۔ باپ کے جانے کے بعد گھر پر جو مصیبت آئی اس میں اس کی بیماری کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ تب منی انہیں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ ایک دن وہ اس کے دروازے پر آئے۔ کسی نے انہیں بتایا تھا کہ اس گھر میں ایک بیمار بچہ ہے۔ بچے کو دیکھ کر وہ کچھ فکر مند ہو گئے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا بہت ضروری تھا لیکن ڈاکٹر صرف بدھ کو ملیں گے۔ اس دن جمعہ ہی تھا اس بچے کو دوا کے ساتھ غذا کی بھی سخت ضرورت تھی۔ خالی دوا سے کچھ نہ ہوگا۔ انہوں نے تاسف سے سوچا تھا انتہائی کمزور ہوتے بچے کو گود میں لئے آنسو بہاتی منی ان دنوں دو وقت بھر پیٹ کھانا تک

مہیا نہیں کرا پاتی تھی۔ جڑواں بچے اس کے پیٹ میں تھیں۔ آٹھواں مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ وہ کوئی کام نہ کر پاتی۔ خود اسے بھرپور غذا کی ضرورت تھی لیکن وہ دونوں بچوں خاص طور پر پہلوٹھی کے بیمار کے لئے پاگل بنی رہتی۔

''منی۔ میں بدھ کو پھر آؤں گا۔'' انہوں نے کہا'' تمہارے بچے کو اسپتال لے جانے کی سخت ضرورت ہے۔'' پھر انہوں نے کندھے سے لٹکا جھولا اتارا (وہی جھولا جو ہمیشہ ان کے کندھے سے لٹکا رہتا تھا اور آج بھی لٹکا ہوا تھا۔) ''یہ رکھو'' جھولے میں ہاتھ ڈال کر انہوں نے بیچ کے چار انڈے برآمد کئے اور چھ عدد کیلے۔ یہ تحفے پرلے گاؤں میں دو الگ الگ لوگوں نے انہیں دیئے تھے۔ وہ سب کے سب انہوں نے بچے کو دے دیئے۔ یہ نعمتیں دیکھ کر اس کے زرد چہرے اور بجھتی آنکھوں میں جو چمک آئی تھی اسے منی کبھی نہیں بھول سکی۔ جب بھی اس کے جانے کا غم ستاتا وہ مسرت کی اس چمک کو یاد کرتی تو دکھتے دل پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار پڑ جاتی۔ اپنی زندگی کے آخری دو دنوں میں اس کا بچہ بہت خوش تھا۔ وہ اس دنیا سے خوش خوش گیا تھا۔ اس کے پیٹ میں کھانا تھا وہ بھی اچھا کھانا۔ بدھ کے دن جب وہ اسے لینے آئے تو اس کی راکھ ہوائیں اڑا چکی تھیں اور ننھا سا ادھ جلا جسد خاکی گنگا کے پانیوں میں گم ہو چکا تھا۔ لیکن منی نے ان کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔'' اس نے بڑے چاؤ سے انڈے کھائے اپنا ہاتھ بڑھا کر ایک کیلا چھوٹے کو بھی دیا۔ سب آپ کی کرپا تھی۔ وہ بھوکا جاتا تو ہم جتنے دن زندہ رہتے تڑپتے ہی رہتے۔'' اس کے آنسوؤں نے ان کے پیر بھگو دیئے۔ ایسی سخت گرفت تھی کہ ان کے لاکھ چھڑانے پر بھی وہ اس وقت تک نہیں اٹھی جب تک اس کا دل ہلکا نہیں ہو گیا۔ تب ہی انہیں منی کے شوہر کے بارے میں پتہ چلا۔ کہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر سیا سے کسی تکرار کے سبب اس نے اس کے خلاف مخبری کی تھی۔ جھوٹی یا سچی یہ معلوم ہونا مشکل تھا۔ نیپال سے کیندو کی پتیوں اور کتھے کی اسمگلنگ بہت عام تھی۔ ہو سکتا ہے وہ صرف موٹر بوٹ چلاتا رہا ہو اور اسے مال کا علم نہ رہا ہو، ہو سکتا ہے ملوث رہا ہو جو بھی ہو وہ ایک بہت ہی چھوٹی مچھلی تھا جسے بڑی مچھلیاں نگل گئی تھیں۔ اس سلسلے میں انہیں کامیابی نہیں مل سکی لیکن منی احسان مند تھی کہ کسی نے اس کے بارے میں سوچا تو،

کچھ کیا تو۔ اس کے دوسرے بچے کو پولیو ہو گیا تھا۔ وہی تھے جو اسے اسپتال لے گئے۔ آپریشن کرایا۔ اسپتال سے اسے لوہے کا جوتا بنوا کر دیا گیا جس کا فریم گھٹنے تک تھا۔ وہ لنگڑا تا اب بھی تھا لیکن پہلے سے بہت اچھا ہو گیا تھا۔ پہلے تو وہ جس طرح چلتا تھا اسے دیکھ کر کسی کریہہ صورت پھدکنے والے جانور کی یاد آتی تھی۔ منی کا دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ کئی بار اسے خیال آتا تھا کہ اوپر والے کو اس کا بیٹا لینا ہی تھا تو اس ٹوٹے پھوٹے کو لے لیا ہوتا۔ صحیح سالم چلا گیا، یہ رہ گیا لیکن پھر ان کی کوششوں سے اب وہ اس لائق تھا کہ اپنے سارے کام آسانی سے کر لے۔ جلد ہی وہ اسے کسی دوکان میں بٹھانے کی سوچ رہی تھی۔

لڑکا جب اسپتال سے لوٹا تھا، اس وقت بھی منی نے ان کے پیروں پر سر رکھ دیا تھا۔ شرک اور کفر اس کی لغت میں نہیں تھے۔ ہوتے بھی تو ان کے معنی اس کے ذخیرے میں نہیں تھے۔ بھگوان خود اتر کر نہیں آتے۔ کسی انسان کو بھیج کر ہی کام کراتے ہیں وہ جسے بھیجیں وہی ان کا روپ۔

تسلے میں آگ روشن ہو اٹھی تھی۔ وہ اسے ان کے پاس لے آئی۔ پھر ایک بڑے سے ٹیڑھے میڑھے المونیم کے کٹورے میں دو گلاس پانی، گڑ، آنگن میں لگے تلسی کے پودے سے اتاری پتیاں اور دو چار دانے کالی مرچ کے ڈال کر ابالنے کو چڑھا دیے۔ پانی خوب ابل گیا تو اس نے المونیم کے دو گلاسوں میں چائے ڈھالی اور اپنا گلاس لے کر خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ گنگا کی ریت سے مانجے گئے المونیم نے پستہ قد، مدھم شعلوں کی روشنی میں چاندی کی طرح لشکارا مارا۔

مالک بڑا کارساز ہے۔ منی کی جھونپڑی راستے میں نہ ہوتی تو وہ ٹھنڈ سے اکڑ گئے ہوتے۔ ان کے لئے تو اس وقت پھوس کی صرف ایک چھت کافی تھی۔ خالی پیٹ میں توانائی دیتا گڑ اور ٹھنڈے جسم میں گرماہٹ بھرتی تلسی اور کالی مرچ کی چرپراہٹ۔ ایک ایک گھونٹ امرت تھا۔

"جا کے سو جاؤ منی۔ رات بہت ہو چکی ہے۔" انہوں نے نرمی سے کہا

"سب لوگ آپ کے بارے میں بہت باتیں کرتے ہیں۔ کبھی من ہوتا تھا ہم

آپ کے پاس بیٹھیں۔ معلوم ہے لوگ کیا باتیں کرتے ہیں"

"یہ بھی معلوم ہے" وہ مسکرائے

"کیا معلوم ہے؟"

"میں سوالوں کے جواب دیتے دیتے تھک گیا ہوں۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی انسان ایسا مل جاتا ہے جو نئے سرے سے سارا کچھ پوچھنے لگتا ہے۔ تم بھی یہی سب پوچھنا چاہتی ہو کہ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں، میرا کنبہ کہاں ہے، گذارا کیسے چلتا ہے، یہاں کیوں رہتا ہوں۔۔ ہے نہ؟"

منی نے سادہ دلی سے سر ہلا دیا۔

وہ ہنس پڑے "چلو تم بھی سن لو۔ میرے ماں باپ اب نہیں رہے۔ جب میں یہاں آیا تھا تب تھے۔ بھائی بہن ہیں۔ دوست احباب ہیں لیکن میں ان سب کو بہت دور چھوڑ آیا ہوں۔" انہوں نے قدرے توقف کیا۔ ایک محبوبہ بھی تھی۔ امیدوں کے چراغ روشن کئے مستقبل کے خواب دیکھتی۔ میں نے اس کی دنیا تہہ و بالا کر دی۔ اسے بھی چھوڑ آیا لیکن یہ انہوں نے منی سے کہا نہیں اور بات کا سرا پھر پکڑا" وہ سب باری باری مجھے کچھ پیسے بھیجتے رہتے ہیں ان سے میرا گذارا ہو جاتا ہے۔ دوسروں کی مدد کے لئے کچھ بچا بھی لیتا ہوں۔ میں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ پھر بھی کبھی بھوکا نہیں سوتا ہوں تم میں سے بھی جن لوگوں کے پاس کچھ ہے اور وہ مجھے دینا چاہتے ہیں تو لینے سے انکار نہیں کرتا۔ کبھی کوئی گوالا ایک لوٹا دودھ تھما دیتا ہے تو کوئی گرہست کلو، آدھ کلو سبزی"

وہ تو آپ دوسروں کو بانٹ دیتے ہیں۔"

"جو میری ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے یا مجھے درکار نہیں ہوتا بس وہی۔ اب ابھی مجھے تمہاری اس گرم گرم چائے کی سخت ضرورت تھی۔ وہ میں کسی کے ساتھ نہ بانٹتا۔" انہوں نے بچوں جیسی معصوم اور شدید مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ منی نے سر گھمایا۔ ان کی ضرورت سے زیادہ ان کے پاس کیا ہوتا ہے اور کب ہوتا ہے۔ ابھی کوئی آجائے تو آدھی چائے تو اسے پلا ہی دیں گے۔

''آپ۔آپ کا پریوار؟''

''میرا پریوار تم لوگ ہو۔آس پاس کے چاروں گاؤں میرا پریوار ہیں''

''بال بچہ پیچھے چھوڑ آئے؟''

''میرا کوئی بال بچہ نہیں''

''عورت؟''

''عورت نہیں ہے اسی لئے تو بال بچہ بھی نہیں ہے۔مگر ان گاؤں کے، جہاں میں کام کرتا ہوں، سارے بچے میرے بچے ہیں۔تمہارے بچے بھی منی۔''

منی کے تینوں بچے گدڑی میں لپٹے گہری نیند سو رہے تھے۔اس کا جی بھر آیا۔کچھ دیر وہ خاموش رہی۔باہر ہوا زیادہ پاگل ہو اٹھی تھی۔کسی چڑیل کی طرح سیٹیاں بجاتی، ہائیں ہائیں کرتی، گنگا ماں کی زلفوں میں لہروں کے گھونگھر ڈالتی، شرارت پر آ، وہ ٹھنڈی یخ ہوا۔ 'بڑی ٹھنڈ ہے'، کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہی۔

اس نے پھر آنکھیں اٹھائیں۔

''تو آپ نے بیاہ کیا ہی نہیں۔''

''منی آج تم اتنے سوال کیوں کر رہی ہو''

''آج ہی تو آپ کے ساتھ اس طرح بیٹھنے کا موقع ملا ہے مالک۔''

''کتنی بار کہا مجھے مالک کہہ کر مخاطب نہ کیا کرو۔'' وہ قدرے جھنجھلا کر بولے۔

''ہاں میں نے بیاہ نہیں کیا۔'' جواب دے ہی دیں ورنہ یہ بیوقوف مچھوارن دماغ چاٹتی رہے گی۔ ان کا لہجہ پھر معمول کے مطابق نرم اور پرسکون تھا۔تو عورت کا سکھ انہوں نے کبھی نہیں جانا اور نہ جانے کون کون سے سکھ نہیں جانے۔بے وقوف مچھوارن نے سوچا بانس کے ٹٹر کی جھونپڑی میں اکیلے رہتے ہیں۔ایک پتیلی میں آلو اور چاول ساتھ ابال لیتے ہیں۔اپنی تھالی خود مانجنا، اپنے کپڑے خود دھونا۔سنا تھا ایک بار اکیلے پڑے بخار میں بھن رہے تھے۔سنجوگ سے کوئی ادھر جا نکلا۔پرلے گاؤں کے مسلمانوں کے یہاں کا لڑکا تھا وہ انہیں اٹھا لے گیا۔سنا ہے اس سے کہا کہ میں مر جاؤں تو کوئی پرپنچ نہ کرنا۔جو کپڑے پہنے

غضبناک۔ کبھی نہ ڈرنے والی منی اس وقت کچھ خوفزدہ ہو اٹھی۔ کس چیز سے یہ خود اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ سانپ امرود کے پتوں میں دبکا، خود ہی ڈرا بیٹھا تھا اور ادسارے میں ایک بہت ہی نیک پاکیزہ انسان سویا ہوا تھا۔ پھر اسے کس چیز کا ڈر تھا؟ وہ کچھ بے چین سی، ان کے سرہانے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ان کی سانسوں کا زیر و بم اور ہلکے خراٹے گہری نیند کے غماز تھے۔ کچھ لمحوں بعد وہ وہیں بیٹھ گئی۔ تسلے کی آگ بجھ کر بہت سی راکھ چھوڑ گئی تھی لیکن راکھ کے اندر انگارے تھے اور راکھ گرم تھی۔ اس نے ایک ٹہنی سے اسے کریدا تو چنگاریاں اڑیں۔

کچھ دیر تک وہ اپنی کثرت استعمال سے پتلی پڑتی ساڑی کے پلو سے خود کو لپیٹ لپیٹ کر کچھ سوچتی رہی پھر دھیرے سے ان کی بغل میں سرک آئی۔ سخت محنت سے گٹھا ہوا، اٹھائیس سالہ جوان جسم کمان کی طرح تنا اور پھر چراغ کی طرح لو دے اٹھا۔

آدم کے ساتھ حوا کا تخلیق کیا جانا کچھ ایسا بے مقصد تو نہ تھا۔

مالک جانے بغیر دنیا مت چھوڑے گا۔ آتما بھٹکے گی۔ یہ سکھ...... بھوگے نہ بھوگے، جان تو لیجئے ایک بار......"

ان کی آنکھ کھل گئی چمکیلی سیاہ آنکھوں والی روہو مچھلی جیسی وہ لابنی، چھریری گٹھی ہوئی سڈول عورت ان کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑی تھی۔ چاروں طرف گھنٹیاں بج رہی تھیں ٹن ٹن ٹن ٹن خطروں کی، مصیبت کی اور کسی انہونی کی پیشن گوئی کی۔ موسیقی سے لبریز لیکن ڈراونی اور پورا جسم طوفان کی زد میں آئی ناؤ کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔

مہاتما بدھ ویسے تو اہنسا کے پجاری تھے لیکن کوئی کشکول میں گوشت ڈال دیتا تو کھا لیتے لیکن کیا جب مار نے انہیں گمراہ کرنے کے لئے اپنی بیٹیوں کو بھیجا تھا تو وہ انہیں شکست نہیں دے سکے تھے؟ کیا انہوں نے اپنی خواہشوں پر مکمل قابو نہیں پا لیا تھا؟

میں مہاتما نہیں ہوں۔ میں بدھ بھی نہیں ہوں۔ مجھے عرفان کہاں حاصل ہوا ہے؟ عرفان کی تلاش میں تو میں نکلا بھی نہیں ہوں ہاں اگر بنی نوع انسان کی خدمت سے عرفان ملتا ہے تو شاید کبھی مجھے بھی حاصل ہو جائے اور کیا سوچتے تھے کن پھٹے جوگی کہ عورت کا سکھ ویسا ہی ہے جیسا آتما کے پرماتما میں ضم ہونے کا سکھ۔ مرنے سے پہلے ایک بار اگر جان لوں

کہ یہ یہ ہوتا ہے تو برائی ہے میں نے شراب کا سرور جانا ہے اچھے بھر پیٹ کھانے، گہری نیند، ماں کی گود، عورت کی محبت ان سب سے آگاہ ہوں۔ صرف جسم ہی نہیں جانتا۔ شاید میں پوری طرح خود پر قابو نہیں پا سکا ہوں ورنہ اس تجربات میں یہ شعلے نہ بھڑکتے اب تک تو انہیں نکال کر اس کی سل سل کرتی مچھلی کو واپس گنگا میں پھینک دیا ہوتا۔

شعلے پہلے بھی کئی مرتبہ بھڑک چکے تھے۔ آخر وہ انسان ہی تو تھے۔ لیکن انہوں نے چھڑکاؤ کر کے پانی سے انہیں بجھا دیا تھا۔ ہر بار کفارے کے لئے انہوں نے تین دن لگاتار روزے رکھے تھے۔ مسلمانوں کے روزوں سے بھی زیادہ سخت روزے۔ مسلمانوں سے زیادہ سخت یوں کہ روزہ کھول کر بھی وہ بھر پیٹ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ کبھی کبھی تو محض ابلے آلو یا کھیرا ککڑی کھا کے رہ جاتے تھے۔

ابھی حال ہی کی تو بات ہے

ان دنوں دریا کے اس پار والے گاؤں کی باری تھی۔ وہ ایک بیمار شخص کو اسپتال میں داخل کر کے واپس گھر پہنچ رہے تھے۔ وہاں کنویں پر گاؤں میں بیاہ کر آئی نئی بہو سنندا کھڑی تھی۔ پانی نکالنے کے لیے اس نے ایک پیر خوب آگے بڑھا کر جسم کو تان رکھا تھا۔ سنہری، پکے گندم جیسی جلد والے سڈول پیر پر اس کا واحد زیور، چاندی کی پائل بہت ہی بھلی لگ رہی تھی۔ پانی کھینچتے ہوئے سنندا کے پورے جسم میں ارتعاش تھا۔ لگتا تھا ماں باپ کے گھر وہ کنویں سے پانی نکالنے کی عادی نہیں رہی تھی۔ اس کی ساڑی جسم سے سرک گئی تھی۔ گدبدا قدرے بھاری، گداز جسم بھی بلاؤز سے چھلکا چھلکا پڑ رہا تھا۔ ان کی نظریں اس کے خوبصورت پیر پر ذرا کی ذرا رکیں اور پھر سرسر کرتی سیدھی گردن تک پہنچ گئیں۔ سنندا کے جسم کا ارتعاش ان کے اپنے جسم میں منتقل ہو گیا۔ انہوں نے خود پر لعنت بھیجتے ہوئے نظریں ہٹا لیں۔ لیکن وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ نظریں جتنی دیر ٹھہری تھیں وہ وقفہ من سب سے بہت زیادہ تھا اور جو وقفہ گذرا تھا وہ صحیح نہیں تھا وہ نظریں محض خدا کی ایک حسین تخلیق کی ستائش کرتی نظریں نہیں تھیں۔ وہ ایک مرد کی نظریں تھیں جو ایک عورت کی ستائش کر رہی تھیں۔ انہوں نے خود پر کفارہ واجب کیا کیوں کہ ان کا ضمیر ان سے جو سوال

کر رہا تھا اس کے لیے ان کے پاس خاطر خواہ جواب نہیں تھا۔

مچھلی نے اپنی کالی چمکیلی، کاجل بھری آنکھوں سے انہیں پھر دیکھا۔ ترشنا لے کر دنیا سے مت جاؤ سنیاسی جان لو کہ تم کیا نہیں جانتے ہو۔ یہ تسلی بھی کر لو کہ جس نفس کو تم نے قابو میں کیا ہے وہ بڑا بے لگام منہ زور گھوڑا ہے بعد میں اپنی پیٹھ ٹھوکتے رہنا۔ مگر ایک بار ......صرف اس بار......

اس لمحے نے مزید کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیا وہ ان پر حملہ کر بیٹھا۔ جیسے نیپال میں برف پگھلنے کے بعد طغیانی پر آئی بے بضاعت گنڈک خونخوار ہو کر طاقتور گنگا پر چڑھ دوڑتی ہے اور گنگا اپنی تمام تر غضبناکی کے باوجود کروٹیں بدل بدل کر اسے اپنے اندر ضم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

.....صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ جو ہوا وہ کیا تھا۔ وہ ایک برا خواب تھا یا ایک اچھا خواب۔ بڑی دہشت کے ساتھ ان کی عقل وفہم نے بتایا کہ وہ خواب نہیں تھا، حقیقت تھی اور مزید دہشت ناک بات یہ تھی کہ نیند کے جالے صاف ہو جانے کے بعد قلب وذہن پر سرور کی کیفیت طاری ہو رہی تھی، جسم ایک پر کیف درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ روح پر کبھی نہ مٹنے والے نشان پڑ گئے تھے۔ ان کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ ساری ریاضت مٹی میں مل گئی تھی اور انہیں یہ اچھا لگ رہا تھا۔

منی ان سے پہلے اٹھ چکی تھی۔ اس ٹھنڈ میں کنویں سے پانی کھینچ کر وہ نہا چکی تھی اور ان کے لئے مٹی کے چولہے پر چائے چڑھا چکی تھی۔ اس کی ستھری آنکھوں میں کوئی پشیمانی نہیں تھی، گناہ کا کوئی احساس نہیں تھا۔ بس ایک طمانیت تھی۔ ایک سکون تھا۔ اس کی محبوب ہستی اس کے دروازے پر آئی تو اس نے اس کے کشکول میں وہ ڈال دیا جو اس کے پاس تھا۔ نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔ اس نے مٹی کی رکابی میں بھوبل میں بھنی شکر قند اور المونیم کے گلاس میں چائے لا کر رکھ دی۔ انہوں نے شکر قند سرکا دی صرف چائے کا گلاس اٹھالیا۔

چائے پی کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے

جھونپڑی کے دروازے پر وہ روبرو ہوئے

# سنسکرتی کا پانچواں ادھیائے

## (محلے میں الّو)

حکیم انوار حکمت کم کرتے تھے مطب پر بیٹھ کر لکچر جھاڑتے (جن میں اکثر لیگیوں کو گالیاں اور نہرو۔ گاندھی کی سیاست پر تبصرہ شامل ہوتا) یا شکار کو نکل کھڑے ہوتے۔ بڑا شکار تو کبھی نہیں کیا بس ایک دوبار بھیڑیے مارے تھے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے انعام پایا تھا۔ اسی موقع پر ان سے نیل گائے کے شکار کا پرمٹ لے لیا تھا۔ معاملے کے صاف انسان تھے اس لئے پرمٹ ضروری سمجھا ورنہ اکثر گاؤں کے کسان جوان کے مریضوں میں شامل تھے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے کہ بھیا کھڑی فصل ہے، دس بیگھہ میں سے دو تو کھا گئے باقی جو ہے وہی بچ جائے، آ جایئے۔ کبھی ٹھاکر چلے آتے حکیم صاحب ہم خود تو نہ ماریں گے۔ آپ چلے چلئے۔ جیپ کہئے تو بھجوادیں۔'' از راہِ مذاق حکیم صاحب کبھی کبھی بھاؤ بڑھاتے ''ارے ٹھاکر صاحب! مطب کا بڑا حرج ہوتا ہے۔ مریض آ کے لوٹ جاتے ہیں۔'' پھر کچھ دیر بعد ہنس کر حامی بھر لیتے۔ ساتھ میں چلتے وضو لیا اڑی۔ مضبوط، گورے چٹے، سیاہ داڑھی، دیکھنے میں بظاہر شریف صورت لیکن کبھی جو بیچ بول جائیں تو معلوم ہو کہ آج بھونچال ضرور آئے گا اور ڈھیٹ ایسے کہ مونچھیں پالنے کے شوقین راجہ صاحب حسن پور سے کہہ آئے، ''مونچھوں پر تاؤ دینا ہے حضور تو میری مانئے۔'' بڑے نخوت آمیز وقار کے ساتھ راجہ صاحب نے نظریں اٹھائیں۔ ڈرامائی توقف کے بعد وہ بولے ''حضور نیلے کے پایوں کا شوربا لگا کے اینٹھئے جب تک گومتی میں ناک پکڑ کر گھنٹہ بھر کی ڈبکی نہیں لگائیں گے۔ خدا کی

قسم مونچھ کا ایک بال ادھر سے ادھر نہ ہوگا۔" راجہ صاحب کے جگری دوست گنگیؤ کوٹھی والے میرن میاں نے ایسا قہقہہ لگایا کہ چھت گیری سے لٹکے فانوس ہل گئے۔ حاضرین میں کچھ کمتر رتبے والے حضرات بھی تھے کوئی ادھر دیکھنے لگا، کوئی ادھر لیکن موتہہ دبا دبا کے روکی گئی مسکراہٹ چھپی نہ رہی۔ اب راجہ صاحب پرانے وقتوں والے راجہ صاحب نہیں تھے کہ مہاوتوں اور چماروں کے علاوہ بھی جسے چاہا درختوں سے بندھوا کے پٹوا دیا لیکن ایسی خشمگیں نظروں سے وصو میاں کو گھورا کہ وہ جوتے چھوڑ کر سٹک لئے۔ مہینہ بھر بعد بھی جب گئے جب راجہ صاحب نے کہلوایا کہ انہیں معاف کر دیا گیا ہے وہ اپنے لطیفوں سے دربار کو محروم نہ کریں۔ پرانے اخبار میں لپیٹ کر ان کے جوتے بھی انہیں بھجوا دیے۔

وصو لپاڑی کی گھٹیا حرکتوں اور مبالغہ آمیز داستانوں سے چڑنے کے باوجود حکیم صاحب شکار کو جاتے تو انہیں تو ضرور لے لیتے۔ اصل میں وہ نہایت جگاڑو آدمی تھے۔ چاپلوسی سے عار نہ تھا کہیں نہ کہیں سے جیپ مہیا کرا لیتے تھے۔ پھر اگر اچانک کسی فرمائش پر شکار پر جانا پڑ گیا اور جیپ کا انتظام ممکن نہ ہوا تو ان کے سالے کے پاس پھٹپھٹیا تھی جسے حکیم صاحب نے چلانا بطور خاص سیکھا تھا۔ ان کے اپنے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ پھر یہ کہ حکیم صاحب نفاست پسند آدمی تھے۔ گولی چلا کر ہٹ جاتے۔ جانور گرتا تو وصو میاں دوڑتے چھرے بجاتے ویسے دو چار گاؤں والے پہلے سے آن موجود ہوتے تھے۔ لیکن وصو میاں نہ ہوں تو گوشت کی تقسیم اور ذبح کیا جانا خاصہ دشوار ہو جاتا۔ کبھی کبھار دو جانور گر جاتے ایک مسلم گاؤں والوں کے لئے چھوڑ دیا جاتا ایک وصو میاں لدوا لیتے۔ حکیم صاحب کے گھر آ کر کھال اتارنا جھے بخرے کرنا، باہر سے پکار کر حکیمن سے کہنا "بھابھی اس بار پائے ہم چھوڑ جا رہے ہیں، ہاں کپے ہوئے ایک ڈبہ لیجائیں گے۔" یا "بھابھی پائے اس بار ہم لے لیں، گردے کلیجی آپ کے لئے رکھ دیے ہیں۔" محلے میں بقر عید ہو جاتی۔ سب کے گھر سینی پر رکھ کر حصہ جاتا۔ اس زمانے میں فرج نہیں تھا۔ حکیمن فراخ دلی سے گوشت بٹوا دیتیں۔ وصو پوری ران معہ دوسرے دل پسند حصوں کے لے جاتے۔ ان کی سگھڑ محنتی بی بی گوشت گرم کر کے، چھینکوں پر لٹکا لٹکا کے فرج کے بغیر بھی ہفتہ بھر چلا لیتی تھیں۔

ٹھاکروں نے خبر بھجوائی۔ ریوڑ آ کے ارہر کے کھیت میں پڑا تھا۔ وصو میاں اتنے شارٹ نوٹس پر جیپ مہیا نہیں کرا پائے۔ سالے صاحب سے کھٹیا مانگ کے لائے۔ جب تک یہ لوگ گاؤں پہونچے ریوڑ کافی نقصان کر کے ایسا غائب ہوا تھا کہ دور دور پتہ نہ ملا۔ کم بخت کوئی کم عمر یا کمزور نیلا پیچھے ہی چھوٹ گیا ہوتا۔ ایک مسلمان مہاوت نے بتایا۔

''ہاں لیل گاہ تو رہیں۔ بہت رہیں'' پھر اس نے نہایت مسرور کن لہجے لیکن قدرے سرگوشی کے انداز میں کہا'' ٹھاکرن کے کھیت میں رہیں۔ تھوڑی دیر اور رہ جاتے '' وصو میاں نے اس کے رازدارانہ انداز پر اسے گھور کر دیکھا۔ وہ جلدی سے گڑبڑا کر بولا '' بہت لوگن کے ہڑیا بھر جات بھیا۔'' حکیم صاحب کے چہرے پر گہری مسکراہٹ آئی۔ اپنی ہنڈیا بھرنے سے زیادہ اسے ٹھاکروں کے نقصان کی خوشی ہوتی۔

ایک سیار کھوّے نے شکار پارٹی کی معلومات میں اضافہ کیا (گاؤں کے نوجے سیار کا گوشت کھانے کے سبب اکثر سیار کھوّے کہلاتے تھے)

''بھیا جانے نہیں ہیں۔ اچھا ہوا جو لیل گاہ چلے گئے۔ وہ اصل لیل گاہ نہیں تھے۔ اُدھر سے آئے تھے............''

''کدھر سے؟''

''آج جمرات ہے نہ بھیا''

''ابے تجھے جمعہ جمعرات سے کیا مطلب؟''

''مطلب ہے نہ بھیا۔ جمرات کے روج پانچوں پیرن کی طرف سے لیل گاہ آتے ہیں۔ کھیت کے کھیت چر کے، روند کے نکل جاتے ہیں۔ ان پر گولی چلاؤ تو اثر ہی نہیں کرتی۔ ہاں بھیا اور کتنا کھیت کھا جائیں۔ فصل میں برکت ہوتی ہے۔ اب دیکھو نہ ٹھاکروں کی کھڑی ارہر گرا گئے۔ ان کے کوئی کمی تھوڑی ہی ہوگئی۔''

''ابے بھاگتا ہے کہ نہیں۔'' وصو میاں اپنی ہانڈی بھرنے کا موقعہ ہاتھ سے گنوانے کے سبب سخت جھنجھلائے ہوئے تھے۔ کئی دن سے گھر میں گوشت نہیں پکا تھا۔ وہ تو تیرے میرے یہاں کھاتے پھرتے تھے۔ لیکن بیوی بچے۔ آلو کی سبزی، چولائی کا ساگ

چھوڑ کچھ اور پک ہی نہیں رہا تھا۔ جبار خاں سول انجینئر کی والدہ حکیم صاحب کے علاج میں تھیں۔ ان سے کہہ سن کر حکیم صاحب نے لپاڑی وصومیاں کو ائر پورٹ پر گرائی جانے والی پرانی عمارت کی اینٹیں اٹھوانے کا ٹھیکہ دلوا دیا تھا۔ وہ ملبے کے ساتھ نئی عمارت کی تعمیر کے لئے آئی اینٹیں بھی اٹھوانے لگے۔ انجینئر صاحب کو خبر ہوئی تو حکیم صاحب سے شکایت کی کہ انہیں کی سفارش پر انہیں کام دیا گیا تھا۔ حکیم صاحب نے انجینئر صاحب کو چائے پر مدعو کیا۔ وصو لپاڑی کو بھی بلوایا۔ شکایت منہ پر دوہرادی۔ بغیر پلک جھپکائے وصومیاں نے کہا ''انجینئر صاحب آپ کے بچے ملائی کھائیں، میرے روٹی بھی نہ کھائیں۔ یہ کیسے چلے گا'' اور اٹھ کر چل دیے۔ ان کا ٹھیکہ کینسل کر کے شمبھوناتھ تواری کو دے دیا گیا۔ تب سے وصومیاں خلاف مزاج تھوڑے سے جھونجھل کھائے رہنے لگے تھے۔

اب اتنی دور آ ہی گئے ہیں تو ذرا اور ڈھونڈ لیں۔ آخر نیل گایوں کا ریوڑ ہی تو تھا۔ مرغابیاں تھوڑی ہی تھیں کہ ذرا اُڑی تو آسمان، آسمان جانے کہاں نکل گئی۔

تین تو پہلے ہی بج چکے تھے ڈار کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ نہیں دکھائی دی تو نہیں دکھائی دی اور پانچ بجنے لگے۔ جاڑوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ جنگل میں جھٹپٹا اترنے لگا۔

وصو نے سر کھجایا۔ ''قبلہ حکیم صاحب۔ لگتا ہے واقعی وہ پانچوں پیرن سے تشریف لائے ہوئے حضرات تھے۔ اصلی نیلے نہیں تھے۔ ارہر کی پھلیاں کھانے کا شوق چرایا رہا ہوگا۔'' ان کے لہجہ میں ان کی فطری کمینگی بمعہ مسخرہ پن موجود تھی۔ ''اب واپس ہو لیجیے۔''

حکیم صاحب نے برگد کے درخت پر بسیرا لیتے، پھلی کھانے کو اترے ہریلوں پر فائر کیا۔ بھرا مار کے اڑ گئے۔ ایک نہ گرا۔ ''آج نہ جانے کس کا منہ دیکھا تھا۔'' وہ بڑبڑائے۔

''حضور، بھابھی صاحب نے چلتے وقت کچھ چھری چاقو کا نام تو نہیں لے لیا تھا۔ یا ہو سکتا ہے سالن پکانے کی تیاری کرنے لگی ہوں۔''

''جمرات کے دن نکلو تو یہی ہوئیے۔'' یہ اللہ رکھا مہاوت تھے جو شکار کی آس میں ابھی تک ساتھ ساتھ تھے ''ابے چپ سسرا۔ سب نے جمرات کی رٹ لگا رکھی ہے۔''

وصومیاں پہنچے۔

پارٹی واپس ہونے لگی۔ پھٹپھٹیا ٹھاکر صاحب کے یہاں کھڑی کر دی گئی تھی۔ ریوڑ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے کوئی تین میل تو پیدل نکل ہی آئے تھے۔ ٹھاکروں کی بگیا پہونچتے پہونچتے سورج غروب ہو گیا۔ راستے میں دو چار الوؤں کی ہو ہو سنائی دے گئی تھی۔ کچھ چمگادڑ بھی سر پر سے گذر گئے تھے۔ آموں کے جھرمٹ میں ایک پستہ قد درخت پر وہ بیٹھا گول گول دیدے گھما کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ مڑے تو اس نے اپنی گردن بھی گھمائی اور گول بلی جیسا مونہہ انکی طرف دیکھ کر مذاق اڑاتا ہوا چلایا۔ ''ہُو ہُو ہُو — حُق ہُو — حُق ہو۔'' جیسے قہقہہ لگا رہا ہو۔ مار لئے نہ نیلے۔ ٹھاکروں نے کہلوایا تھا آج تو جیپ میں جگہ نہ رہے گی اور سارے گاؤں کے مسلمان (اور کچھ ہندو بھی) سب گوشت اُڑائیں گے۔

وصومیاں نے حکیم صاحب کی ائرگن کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ وہ اکثر اسے لے لیا کرتے تھے۔ شاید کہیں تیتر یا خرگوش مل جائے۔ دو تالی سے تو ان کے چھترے اڑ جاتے تھے۔ خرگوش کا گوشت وصومیاں کی اہلیہ بڑے شوق سے کھاتی تھیں۔ آج تو نہ خرگوش ملے نہ تیتر ہی دکھائی دیا۔ غصے میں انہوں نے اس منحوس صورت ہنسنے والے پر جو نشانہ مارا تو اس کے بازو کے جوڑ پر جا کے لگا اور وہ دھپ سے نیچے آ گرا اڑنے کی کوشش کی تو چند بالشت اڑ کر پھر دھپ۔ شکار تو ملا نہیں چلو تماشہ ہی سہی۔ وصومیاں نے اس بڑے سے جغادری الو کو پکڑ کر جھولے میں ڈال لیا۔ سانس لینے کے لئے ذرا سا ڈھیلا چھوڑ کر جھولے کے منہ پر ستلی باندھ دی۔

''بھیا دیکھو ذرا۔ ٹھاکروں کے گماشتہ نورمیاں نے جھرجھری لی۔ شام کا وقت، جمعرات کا دن اور موچڑئی کو گرا لیا''۔ جو سورتیں یاد تھیں وہ انہوں نے جلدی جلدی الٹی سیدھی پڑھنی شروع کیں۔

''ہرے رام، ہرے رام ...'' ٹھاکروں کے آفیشیل پجاری سنت رام پنڈت نے جو لمبی سفید داڑھی کے سبب عرف عام میں باباجی کہلاتے تھے اور سندھیا آرتی کے لئے اسی وقت پوجا کی تھالی لے کر وہاں سے گذر رہے تھے، خوف زدہ نظروں سے وصو لپاڑی اور

حکیم صاحب کی طرف دیکھا۔

''آداب بابا۔ کیوں پریشان ہیں؟ محض ایک الو نے پریشان کر دیا؟'' حکیم صاحب نے ہنس کر پنڈت جی سے کہا لیکن دیکھا وصومیاں کی طرف۔ ''بنا رہو، بنا رہو'' پنڈت جی نے دعا دی۔ ''ملا سانجھ کے ٹیم میں ای موچڑئی مارے کی کون تک رہی؟ چھوڑ دیؤ سسرے کو۔ اور ہاں بھیا آئے گئے ہو تو تنی ادھ کپاری کے لئے کونوں دوائی بتائے کے جاؤ۔ پنڈتائن جب دکھو تب مُوڑ باندھے پڑی رہت ہے۔''

''کھڑے کھڑے کیا دوا بتائیں بابا۔ مطب آجایئے پنڈتائن کو لے آیئے گا۔ ہم بھی دعا لے لیں گے۔ صحیح دوا حال پوچھ کر ہی ملے گی۔''

''اچھا بھیا۔ مُلا موچڑئی نہیں مارے کے رہا۔ چھوڑ دیو۔ پنکھ ٹوٹا ہے۔ جُڑا جائے۔''

''آپ کی موچڑئی تو ہم ضرور لے جائیں گے۔ محلے کے لڑکوں کو تماشہ ہاتھ آئے گا۔'' وصومیاں نے ہنس کر تھیلا تھپتھپایا تو زخمی الو نے پھڑ پھڑا کر باہر نکلنے کی کوشش کی۔

''رام رام رام۔'' بابا جی کھڑاویں کھٹ کھٹاتے حویلی کے مندر کی طرف بڑھ گئے۔

نور میاں مغرب کی نماز سے پہلے گیس کے ہنڈے جلوا دیا کرتے تھے۔ بجلی ابھی گاؤں کیا شہر میں بھی نہیں آئی تھی۔ انہوں نے کام چور رام کرپال اہیر کو آواز دی جو گائیں دوہنے کے ساتھ ساتھ اس کام میں بھی ان کی مدد کرتا تھا۔ اندر حویلی روشن ہو جاتی تھی باہر اندھیرا پسرا پڑا رہتا تھا۔ سن سن۔ کہیں کہیں سے آتی تیل کی کپیوں کی ٹمٹماہٹ پراسرار کھیتوں اور پگڈنڈیوں کے طلسم میں اضافہ کرتی تھی۔ ایسے میں حکیم صاحب کے پیچھے پھڑ پھڑاتے الو کا تھیلا تھامے وصومیاں بیٹھے اور پھٹپھٹیا چل پڑی۔ راستے میں یوکلپٹس کا قطعہ پڑا۔ لانبے لانبے سفید درخت۔ چاند نے ان کے پیچھے سے جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ شروع کی تاریخیں تھیں۔

''ہم سوچ رہے ہیں میاں وصو'' حکیم صاحب نے کہہ کر توقف کیا۔

''ہاں جناب''

''کہیں جمعرات کی شام کو یہ پانچوں پیرن کی جناتوں والی مسجد سے اڑ کر آنے

والے حضرت واقعی کوئی......"

وصولپڑی کے ہاتھ ذرا کی ذرا ڈھیلے پڑ ڈھیلے پڑے لیکن پھر وہ اپنے فارم میں آگئے "جناب ہم سے بڑا جنات کوئی نہیں۔ ہم پانچوں پیرن جا کے ایک بار نماز پڑھا آئے ہیں۔ ہمارے پیچھے ان لوگوں نے بھی ضرور نماز پڑھی ہوگی۔"

حکیم صاحب نے اتنے زور کا قہقہہ لگایا کہ بانگ کا توازن گڑبڑاتے گڑبڑاتے بچا۔ انہیں معلوم تھا وصومیاں کو نماز پڑھنی تک نہیں آتی۔ ٹھیل ٹھال کے لوگ عید بقرعید لے جاتے تو اٹھک بیٹھک کرآتے ہیں۔

پھٹپھٹیا محلے میں داخل ہوگئی تو لوگوں نے سمجھا پیچھے سے ٹھاکر صاحب کی جیپ پر دو چار نیل گائے، ہرن لدے چلے آرہے ہوں گے۔ معلوم ہوا جھولے میں فقط ایک عدد الو ہے اور پیچھے سے کوئی جیپ نہیں آرہی۔ چھوٹے لال بطیں اور مرغابیاں شوق سے کھاتے تھے۔ ان میں ان کا حصہ ضرور لگتا تھا۔ انہوں نے چبوترے سے پکار کر پوچھا۔

"ہمارے لئے کوئی چڑیا وڑیا بھی نہیں ملی؟"

"ہاں ملی" وصومیاں نے جواب دیا۔ "مو چڑئی ہے۔ کھاؤ گے؟" اور کہہ کر حکیم صاحب کے وسیع چبوترے پر جھولا الٹ دیا۔

"تھوتھوتھو۔ رام رام رام" وصومیاں سے سارا شہر واقف تھا۔ وہ اس طرح کے مذاق کے پوری طرح اہل تھے۔ اس لئے چھوٹے لال کو کوئی تعجب نہیں ہوا۔ بس گھن آئی۔ گرچہ ان کی والدہ کا خیال تھا کہ الو کا گوشت چھوٹے لال عرصہ ہوا کہ کھا چکے ہیں۔ سلامت رہیں ان کی اہلیہ۔

تب شہر بڑا سرسبز ہوا کرتا تھا۔ نیم کے درخت تو تقریباً ہر اہم سڑک پر دو رویہ کھڑے تھے۔ شام ہوتے ہی ان کے درمیان استادہ کھمبوں پر لگے لیمپوں کو میونسپلٹی کے مشعلچی آکر روشن کرتے۔ کبھی کبھار انہیں درختوں پر کوئی الو بھی آنکلتا۔ رات گہری ہوتی اور شہر سو جاتا تو سناٹے میں اس کی "ہو ہو" پیشاب کیلئے اٹھنے والے کسی بوڑھے کو سنائی دے جاتی یا کبھی کبھی سنیما کا آخری شو دیکھ کر لوٹنے والوں کو۔ الو سے اس سے زیادہ براہ راست

تعلق کسی کا نہیں تھا ہاں محاوروں اور گالیوں میں الو ہر وقت موجود تھا۔ پنّا کے ابا مونے تھل تھل رشید خان کا تو تکیہ کلام ہی تھا الو کا پٹھا۔ سارے محلے میں ان کے لئے الو کے پٹھے ہی بستے تھے۔ لیکن محلے میں اصلی الو کی آمد لونڈوں کیلئے خاصی ہلچل کا سبب بن گئی گرچہ سب سے پہلے رشید خان نے ہی انہیں ڈانٹا تھا۔ ''ارے الو کے پٹھو! کیوں بے چارے کو تنگ کررہے ہو۔'' لیکن الو کے پٹھے کیوں مانتے۔ دوسرے دن صبح دن کی روشنی سے بوکھلائے پرندے کے گرد تو زیادہ بڑا جم غفیر لگ گیا۔ مصطفےٰ میاں کے صاحبزادے، شہزادے سلیم ٹھیکے دار کے سپوت منا جنکی صورت زیادہ تر لوگوں کے مطابق اود بلاؤ سے ملتی تھی۔ بج ناتھ لوہیا کے بیٹے بقول اپنی والدہ کل بورن، یعنی خاندان کا نام ڈبونے والے، بلرام لوہیا اور سب سے آگے چھوٹے لال کے وارث بانس دیو جن کا نام دراصل واسودیو تھا۔ محلے کے زیادہ تر لونڈوں کی طرح ان کی بھی دادی ہی شام پڑے ان کے نام کی پکار ڈالتی تھیں ... ''بانس دیو ارے باس دیو ہو چلا۔ ماسٹر صاحب آئے گئے''

دن میں الوؤں کو ویسے بھی دکھائی نہیں دیتا (انسانی الوؤں کو تو کبھی کچھ نہیں دکھائی دیتا دن ہو کہ رات)۔ اوپر سے لونڈوں لپاڑوں کا شور غل، پتھر، ڈنڈے اور سب سے بڑی بات یہ کہ جانوروں سے انسانوں کے درمیان نقل مکانی۔ بے چارہ الو دوسری شام آنے تک جان جانِ آفریں کے سپرد کر چکا تھا۔ یہ حادثہ خود حکیم صاحب کے چبوترے پر پیش آیا جہاں پر پھڑ پھڑاتا، کودتا ہوا الو جا بیٹھا تھا۔ ''ڈنڈے پر اٹھا کے گھورے پر پھینک آؤ'' کسی نے نہایت صائب رائے پیش کی۔ ''ارے ارے ٹھہرو ذرا'' شہزادے کی دادی دوڑی آئیں۔ ان کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب کے یہاں کام آنے والی رفیقن بوا بھی پہونچیں۔ ''بھیا لے کے آئے رہے۔ سب سے پہلے ہم لیں گے۔''

رفیقن بوا نے الو کے گوشت خاص طور پر اس کی زبان کے فیوض پر روشنی ڈالنی شروع کی۔ بلرام کی دادی (جو بغیر بلاوز چیٹی کوٹ ساری پورے جسم پر یوں لپیٹتی تھیں کہ ذرا بے پردگی نہ ہو، اور بلرام کی اماں ایک ہاتھ لانبا گھونگھٹ کاڑھ کے، بھی آن کھڑی ہوئیں۔

دراصل محلے کا کمپلیکیشن کچھ یوں تھا کہ بیٹیاں تو سر ڈھک کے میلے ٹھیلے، اسکول

یا رشتے داروں کے یہاں آتی جاتی رہتی تھیں کہ چہرہ ڈھکنا ان کے لئے ضروری نہیں تھا۔ مسلمان لڑکیاں بارہ تیرہ سال کی عمر کے بعد برقعہ اوڑھنے لگتی تھیں لیکن کچھ نقاب گرا کے اور کچھ نقاب اٹھا کے بھی باہر نکل لیتی تھیں۔ بہوؤں کے لئے ضابطے تقریباً یکساں تھے۔ ہاتھ بھر گھونگھٹ نصف زندگی کڑھا رہتا۔ جب وہ بیٹا بیاہ کر خود ساس کے درجے پر فائز ہو جاتیں تب گھونگھٹ بتدریج اوپر چڑھنا شروع ہو جاتا۔ بس پیشانی پر ذرا سا آنچل سر کا لینا کافی ہوتا تھا۔ جب ساس سسر میں سے کوئی ایک یا دونوں نہیں رہتے اور مادر ملکہ کی حیثیت حاصل ہو جاتی تب گھونگھٹ بالکل ہی غائب ہو جاتا۔ بڑھاپے کی سرحد پر دستک دیتی محلے کی بہوئیں چبوترے پر آکر نالائق بیٹوں یا کم عمر پوتوں نواسوں کو دروازے پر آکر گہار لگا کر بلاتیں کہ کھانا کھائیں یا ماسٹر صاحب آتے ہوں گے تو آکے پڑھیں اور کچھ نہیں تو بڑبونگ بند کریں دونوں وقت مل رہے ہیں۔ بڑی بوڑھیاں ہاتھ میں ڈنڈا لے کے چبوترے پر بیٹھ جاتیں (کہ تقریباً ہر گھر کے سامنے چبوترہ تھا جو 'پکا' کہلاتا تھا) اور آتے جاتے کتوں، بچوں، خوانچے والوں، سب کو حسب توفیق دھمکاتی رہتیں۔ اس میں ہندو، مسلمان کی تخصیص بس اتنی ہی تھی کہ ہندو بوڑھیاں بیوہ ہو جانے کے بعد سلا ہوا کپڑا پہننا عموماً بند کر دیتیں۔ لیکن کیا مجال جو بے پردگی ہو جائے۔ ساڑی باندھ بوندھ کے ڈھلکی چھاتیوں پر اس طرح پھیلاتیں کہ رواں تک نہ دکھائی دے۔ مسلمان بوڑھیاں البتہ مکمل لباس، ساڑی بلاؤز چٹی کوٹ پہنتیں۔ نور محمد کی والدہ سفید سر، سفید ساری، کمر میں قدرے خم لئے سارے محلے کو ڈانٹ کے ٹھیک رکھا کرتی تھیں۔ یہ بانس دیو جب پیدا ہوا تھا تب نور محمد کے والد زندہ تھے۔ اس لئے وہ رنگین ساریاں پہنتیں۔ لیکن چونکہ دادی کے عہدے پر فائز ہو چکی تھیں اس لئے ڈنڈا لے کر لوگوں کو دھمکانے کا عہدہ انہیں بستی میں حاصل ہو چکا تھا۔

بانس دیو تین بیٹوں کے بعد پیدا ہوئے تھے رام دلاری رام جانکی اور رام سنیہی۔ ان کے ابا چھوٹے لال گپتا سخت مایوس ہو چکے تھے کہ کبھی بیٹے کے باپ بھی بن سکیں گے۔ ان کی والدہ محترمہ کئی بار ان کی دوسری شادی کرنے کے ارمان کا اظہار بھی کر چکی تھیں۔ اس لئے جب بہو کو درد زہ شروع ہوا تو وہ آرام سے چھت پر بڑیاں سکھانے چلی گئیں اور چھوٹے

لال گپتا نہایت لاپروائی سے چبوترے پر بیٹھے ناریل پیتے رہے۔ اچانک اندر سے ناچتی، تھالی بجاتی، پرانا دائی نکلی اور نہایت مسرور لہجے میں چلائی ''ارے بیٹا ہوا ہے ٹھیکدار صاحب، بیٹا، چاندی کے کڑے لیں گے۔'' چھوٹے لال گپتا ٹھیکدار گڑگڑی سمیت اٹھتے اٹھتے بچے۔ تب نور محمد کی اماں جو کسی رشتے دار کی پوتی، نواسی کی کن چھیدن سے قدرے ہڑبڑائی ہوئی گھر لوٹ رہی تھیں، چھوٹے لال کے دروازے پر رک گئیں اور بڑی زور سے پرانا کو ڈانٹا۔ ''آدھا محلہ تمہارا جنایا ہوا ہے پرانا اور اتنی عقل نہ آئی کہ تین بیٹیوں کے بعد بیٹے کی خبر یوں اچانک نہیں دی جاتی اور جو کہیں بھیا کو کچھ ہو جاتا تو!'' وہ واقعی سخت ناراض تھیں۔ پرانا شرمندہ ہوگئی۔ تھالی بجاتا ہاتھ رک گیا۔ پھر ایک پھٹکار پڑی۔ ''اری کم بخت اب جب ناچ کود کے بتا ہی دیا ہے تو اب بدشگونی کیوں کر رہی ہے۔ ارے بجا نہ تھالی۔'' اب پھر تو کان پڑی آواز نہ سنائی دی۔ ایک تھالی لے کے نور محمد کی اماں بھی شریک ہوگئیں۔ جب بانس دیو کی پھوپی باجے گاجے کے ساتھ بدھاوا لے کے آئیں تو نور محمد کی اماں نے ڈھولک بجائی۔ نور محمد کی اہلیہ نے اور عورتوں کے ساتھ مل کر 'سوہر' گائے۔ کچھ نوجوان خواتین ناچیں بھی۔ چونکہ پھوپی کے شوہر کا آتش بازی کا 'ہول سیل' کا کاروبار تھا اس لئے حسب ذیل گیت کے بول خاص چٹخارے لے کر زچہ کی طرف سے گائے گئے۔

ارے پیسو نہ لائیں، تماسہ او نہ لائیں' ہوائی گیروا بھتار، نند چھندرو

(چھنال نند نہ پیسہ کوڑی لائی، نہ تماشہ یعنی آتش بازی لائی جبکہ اس کا خصم خود ہی ہوائی گیر یعنی آتش باز ہے)

بانس دیو کی پھوپی نے نہایت خوشدلی سے ہنس کر دو چار ٹھمکے لگائے۔ تین بچیوں کی ماں، بانس دیو کی بائیس سالہ والدہ کو بھی اٹھایا تو دو چار چکر وہ بھی ناچ لیں۔ جس پر نور محمد کی والدہ نے بانس دیو کی دادی کی ہاں میں ہاں ملا کر انہیں ڈانٹا کہ ابھی بدن ''کچا'' ہے ابھی وہ ناچیں کودیں نہیں۔ لیکن بیٹا پیدا کر کے وہ فخر و انبساط کی ایسی ملی جلی کیفیت سے دوچار تھیں کہ کچا پکا کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ بچے کا نام پنڈت جی نے واسو دیو تجویز کیا۔ واسو دیو عرف عام میں بانس دیو ہوگئے۔ سب سے پہلے نور محمد کی والدہ نے کہا ''ارے کیسا نام

دھرے ہیں پنڈت جی۔ بانس دیو!" لیکن ان کو بتایا گیا کہ یہ کرشن جی کا ہی ایک اور نام تھا تو وہ خاموش ہو گئیں۔ اب کرشن جی کی اماں کو کیا سوجھی تھی بیٹے کا اس طرح کا نام رکھنے کی۔ مگر انہوں نے نہایت خوشدلی سے سر ہلایا "تب تو ٹھیک ہے، تب تو ٹھیک ہے۔"

نومولود کی دادی اس وقت نہایت مسرور تھیں۔ بیٹے کی دوسری شادی کی سوچ لینا آسان تھا لیکن کر پانا بھی کیا اتنا ہی آسان ہوتا؟ جھنجھٹ سے بچیں۔ صحرا میں پھول کھلا۔ لیکن اس خوشی کے عالم میں بھی اپنی ہم عمر اور ہم منصب نور محمد کی اماں کے کان میں پھسپھسائیں "ایسے ہی پاگل بنا تھا ہمارا ہوا۔ اب بیٹا ہو گیا تو اور نہ سنے گا ہماری۔ الو کا مانس کھلا رکھا ہے پتو ہوا نے۔"

"تو ہماری والی کون سی کم ہیں۔ نور محمد جورو کے سامنے سنتے ہیں کیا کسی کی۔ الو کا گوشت وہ کھلائیں، دعا تعویذ وہ کریں۔ کئی بار تو بستر کے اندر سے گنڈے تعویز نکال کے پھینک چکے ہیں ہم"

اس وقت بکنگھم پیلس میں بہوؤں کی نئی کھیپ نہیں آئی تھی۔ نہ ہی 1 صفدر جنگ روڈ میں بیٹے جوان ہوئے تھے ورنہ پتہ چلتا کہ سنسکرتی کے پانچویں ادھیائے کا یہ صفحہ تو سلطان پور اودھ کے محلوں سے لے کر دلّی کی شاہی رہائش گاہوں سے گذرتا ہوا بکنگھم پیلس تک کھلا پڑا ہے۔

اس دن محلے کے کئی گھروں میں الو کا گوشت بٹا۔ جو اپنے گھر نہیں لے گئے انہوں نے رفیقن بوا سے وعدہ لیا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اپنے پاس سے لا کر دیں گی۔ آخر درکار ہی کتنا سا ہوتا ہے۔ بس گھس کر ایک پور چٹا دو۔

ظہور محمد کے یہاں بچے بچتے نہیں تھے۔ چار اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے دو لڑکیاں لیکن چاروں ہفتہ بھر کے اندر ہی 'سوری' میں ہی ختم۔ ماں کا روتے روتے برا حال ہوتا۔ علاوہ اولاد کی محبت کے اس پر الزام جو آ رہا تھا اس کا بھی تردد تھا۔ ایک ملنگ بابا گھومتے گھامتے شہر میں آ نکلے تھے۔ بولے بہو پر چڑیل کا سایہ ہے۔ بچہ ہوتے ہی اسے اپنا دودھ پلا جاتی ہے اور بچہ بچ نہیں پاتا۔ گنڈے تعویذ دیے گئے۔ معقول رقم لی کہ اس سے کچھ

عمل پڑھنے کے لئے زعفران، سفید مرغا وغیرہ خریدیں گے۔ یہ بھی کہا کہ بھروسہ نہ ہو تو ظہور محمد خود یہ چیزیں خرید کر لادیں۔ ہاں لانے سے پہلے سات دن صرف پھلوں پر گذر کرنی پڑے گی، بیوی کے قریب نہیں جانا ہوگا اور نہ جانے کیا کیا۔ اب کون ان جھنجھٹوں میں پڑتا۔ اوپر سے ملنگ بابا کو یہ احساس دلاتا کہ وہ شک کے دائرے میں ہیں۔ یہ تیسرے بچے کے بعد کی بات تھی۔ چوتھے کے وقت سب پر امید تھے کہ اب کے بہو چڑیل کے اثر سے آزاد ہوگئی ہوگی لیکن یہ بچہ بھی نہیں بچا۔ کئی لوگوں نے اگلے بچے کے لئے الو کا گوشت گھس کر چٹانے کی تجویز پیش کی تھی۔ سو ظہور محمد کی اماں ایک بوٹی کٹوا کے لے گئیں اور دھوپ میں باریک کپڑا ڈھک کے سکھانے کو رکھ دیا۔

رام آسرے کی نئی دلہن گونا ہو کے آئی تھی لیکن رام آسرے چاقو چھریاں تیز کرنے والی شہد کی رنگت کی آنکھوں اور تانبے کے رنگ کی جلد والی سنہری بنجاری کے پھیر میں تھا۔ ریلوے میں کلرک کی سرکاری نوکری تھی۔

کانسھوں کا پڑھا لکھا باعزت گھرانہ تھا۔ بنجارے ریلوے لائن کے کنارے ڈیرا ڈال کے رہ رہے تھے اس باعزت پڑھے لکھے کو وہ بے عزت جاہل پسند آئی لیکن زمانہ وہ تھا جب لڑکے ماں باپ کو اتنی آنکھیں نہیں دکھاتے تھے کہ گونا لانے سے منع کر دیں۔ اور بیویوں میں ایسی دسیوں کو برداشت کر لینے کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم پائی جاتی تھی لیکن رام آسرے سکینہ کی دسویں جماعت پاس دلہن میں برداشت کم تھی وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھی اور رات کو دبی زبان سے شوہر سے جھگڑتی بھی تھی جو جھگڑا کرنے سے مزید اُلار ہو جاتا۔ اسے الو کے خواص کا کافی علم تھا۔ شوہر پر کوئی ترکیب کارگر نہ ہوتی تھی۔ نہ آنکھوں میں رچایا زائد کاجل، نہ ہونٹوں پر ترچھی مسکراہٹ نہ لڑائی جھگڑے، ہار کر اس نے الو کا گوشت کھلانے کی ٹھان لی تھی لیکن الو کا گوشت ہے کہاں۔ آج کسی لڑکے بالے نے جو محلے کے آخری چھور پر ہوئے تماشے کا ذکر کیا تو اس نے حکیم صاحب کی ملازمہ کو ملنے کے لئے کہلا بھیجا۔ بڑے بابو کے یہاں کا بلاوا پا کر رفیقن بوا نے مرتبے میں خاصہ اضافہ محسوس کیا اور دوسرے دن پہنچ گئیں۔ پان کھلا کر، ساس سے سگرا کے میلے سے کاغذی بیل

منگوانے کا بہانہ کر کے رفیقن بوا کو ایک روپیہ تھمایا اور کان میں پھسپھسا کر ذرا سا الو کا گوشت منگایا۔ اب گھن آئے یا پاپ چڑھے، ٹھس کر ایک پور گوشت رام آسرے بابو کے کھانے میں تو ملا ہی دینا ہے۔

محلے میں ایسی کہانیاں بہت عام تھیں۔ پیارے میاں انصاری، پیارے لال لوہیا، جگ رام داس چودھری، رام داس کسوندھن، اور تو اور مشرائن جن کے یہاں پیاز لہسن کا بھی پرہیز تھا اور میرن صاحب کی بی بی جو محلے کی بچیوں کو قرآن پڑھاتی تھیں اور جن کے پاس لوگ بچوں کو پھنکوانے، لے جاتے تھے۔ سب کو ذرا ذرا الو کا گوشت درکار تھا۔ سب سے قیمتی چیز یعنی الو کی زبان رکھی رفیقن بوا نے اس لئے کہ الو پر ان کا دعویٰ سب سے مضبوط تھا۔ وہ ان کے بھیا یعنی حکیم صاحب نے مارا تھا۔ الو کی تکا بوٹی بھی انہوں نے ہی کی تھی۔

رفیقن بوا اچانک محلے میں اتنی مقبول ہو گئی تھیں کہ اگر چاہتیں تو میونسپلٹی کے الیکشن میں ضرور کھڑی ہو جاتیں اور اپنے مخالف کو خاصے ووٹوں سے ہرا دیتیں۔

# بھیڑیئے سیکولر تھے

''اے حرامجادی بھک منگوں کی بیٹی! بچے کا بہانہ لے کر کب تک وہیں بیٹھی رہے گی۔ برتن بان صاف کرے گا تیرا باپ''

بچے کو تھپکتی ہوئی سروجا ہڑبڑا کر اندر بھاگی۔ تین مہینہ کا مہیش بس ابھی سویا تھا۔ پتہ نہیں پیٹ میں درد تھا یا کیا' دوپہر سے بے چین تھا۔ گود میں لے کر ہی سارا کام نمٹانا پڑا تھا۔ ساس مزے سے حقہ گڑگڑاتی اور سروجا کے خاندان کی مدح سرائی کرتی رہی تھی جنہوں نے ایسی پھوہڑ' زبان دراز کام چور بیٹی اس کے گھر بیاہ دی تھی۔

اندر کی طرف بھاگتے ہوئے سروجا نے ایک اچٹتی نظر بچے پر ڈالی۔ اب وہ پر سکون تھا۔ باہر شام گہرا چکی تھی۔ گھروں میں چراغ جل چکے تھے لیکن باہر اندھیرے اور سناٹے کا راج تھا۔ اوسارے میں جہاں سروجا کی چنگڑی تھی' ایک طرف گابھن بھینس بندھی ہوئی تھی۔ سامنے نشر کا دروازہ تھا۔

مٹی سے تازہ لیپی رسوئی میں پہنچ کر سروجا نے بانس کی ٹوکری اٹھائی جس میں کھیت کی مینڈ سے توڑ کر لایا گیا بھتوے کا ساگ بھرا ہوا تھا۔ ساگ چننے میں بڑی دیر لگتی ہے پھر ٹھیک سے نہ دھوؤ تو مٹی کسکساتی رہ جاتی ہے۔ ایک دن ذرا سی کرکری دانتوں میں آ گئی تھی تو سسر نے تھالی اٹھا کر پھینک دی تھی چولھے پر ساگ چڑھا کر روٹیاں پکانی ہیں۔ کم از کم پچیس روٹیاں۔ اور لال مرچ کی چٹنی بنانی ہے۔ بچہ آرام سے سوتا رہے تو کام چین سے نمٹ جائے۔ دوپہر تو بڑی مشکل ہو گئی تھی بھینس کی سانی پانی' مردوں کو کھیت

پر بھیجنے کیلئے روٹی، ساگ چن کر باہر لگے ہینڈ پمپ پر ٹوکری لے کر جاتے ہوئے اس نے ایک نظر بچے پر ڈالی۔ وہ اب بھی سو رہا تھا۔ دونوں مٹھیاں باندھے نیم دائرے میں دونوں ننی منی ٹانگیں سکیڑے جیسے ننھے بچے سوتے ہیں۔

ہے بھگوان' کچھ دیر اسی طرح چین سے سوتا رہے۔ ساگ دھو کر واپس ہوتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں دعا کی اور آگے بڑھ گئی۔ اس کے چولھے کے پاس پہنچتے پہنچتے ہینڈ پمپ کے عقب سے ایک سایہ سا لپکا۔ گہراتی شام کے اندھیرے میں اس کی جلد کی رنگت اس طرح ہم آہنگ تھی کہ کوئی وہاں ہوتا تو اسے ایک حرکت کا احساس ہو سکتا تھا اس شئے کا نہیں جس نے حرکت کی تھی۔ جگالی کرتی بھینس کا منہ اچانک رک گیا۔ دم بھی بند ہو گئی جیسے وہ دم بخود رہ گئی ہو تبھی اس لمحے ماں کی فطری چھٹی حس کے تحت پانی ٹپکتی ساگ کی ٹوکری زمین پر رکھتے ہوئے سروجا پلٹی لیکن تب تک وہ سایہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بچے کو مضبوط جبڑوں کی گرفت میں لے کر واپس چھلانگ لگا چکا تھا۔

بھینس کی طرح سروجا کا پہلا ردعمل بھی کسی سحر کے زیر اثر دم بخود رہ جانے کا ہی تھا لیکن پھر وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ چیخ کر دوڑی۔ بچوا کے بابو ہمار بچوا ہائے رے دیا ہمار بچوا ''

پانچو کے پہلوٹھی کے بیٹے کو چھل پیری اٹھا کر لے گئی۔ سویرا ہوتے ہوتے خبر پورے گاؤں میں گشت کر گئی تھی۔

ہڈیوں سمیت ملائی کے لڈو جیسا کھا گئی ہوگی تبھی لوگ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے لاش کا پتہ تک نہ ملا۔ بس ایک جگہ اس کے گلے میں پڑے تعویذ جیسا تعویذ ملا تھا جس کے بارے میں خود پانچو مشکوک تھا کہ اس کے بیٹے کا تھا بھی یا نہیں اس لئے کہ ویسے تعویذ گاؤں میں بہت لوگ پہنا کرتے تھے کبھی مولبی صاحیب سے لا کر تو کبھی رام سنیہی اوجھا سے لیکر۔ دونوں کے تعویذوں کی صورت بھی لگ بھگ ایک جیسی ہوا کرتی تھی اور جو ذرا بہت فرق ہوتا بھی ہو تو مٹی میں سن کر جانوروں کے کھروں سے دب کر اپنی شناخت کھو چکا تھا۔

پھر کوئی چار ماہ کے وقفے میں ایک کے بعد ایک تین بچے گاؤں سے اٹھائے

گئے۔ اتفاق سے وہ تینوں بھی لڑکے ہی تھے۔ لوگوں نے کہا کہ پچھل پیری کی نظر لڑکوں پر ہے۔ وہ گاؤں میں لڑکوں کو نہیں پنپنے دینا چاہتی۔

''ہاں جی۔ لڑکیوں کا کوئی کیا بگاڑ سکے ہے۔ دندناویں ہیں چھاتی پہ۔ یہ ہماری تیسری۔ اسے دودھ بھی پورا نہ ملا تو بھی دن دونی رات سوائی بڑھی جاوے ہے۔ نمونیا ہوا 'لوٹ پیٹ کے اٹھ بیٹھی۔'' ساج پوری چاچی نے کہا جنہیں یہ نام شاہجہاں پور میکہ ہونے کی وجہ سے ملا تھا۔ گرچہ وہ گاؤں میں وی ایل ڈبلو مقرر ہوئی تھیں اور انہیں بڑی سخت ہدایت تھی کہ لوگوں کو لڑکے لڑکی میں فرق نہ کرنا سکھائیں۔

ساج پور والی ویسے بھی گاؤں سے باہر کی ہونے وجہ سے طرح طرح کے اوصاف سے متصف کی جاتی رہتی تھیں۔ کچھ لوگ انہیں کل جبھی کہا کرتے تھے۔ ادھر انہوں نے لڑکیوں کو ٹو کا ادھر بنسی کمہار کی چھ سالہ لڑکی اٹھالی گئی۔

کمہار ٹولے میں برتن پکانے کیلئے اکثر بڑے بڑے آوے جلا کرتے تھے۔ آوا رات میں بجھ نہ جائے اس لئے بنسی باہر کھاٹ ڈال کے سویا ہوا تھا۔ اس کے یہاں بٹیا کی بڑی قدر تھی اس لئے کہ اس کے پہلے چھ بچے لڑکے ہی تھے۔ بچی باپ سے خاص طور پر ہلی ہوئی تھی۔ بیچ رات میں اٹھ کے باپو کے پاس جانے کی ضد کرنے لگی۔ دن بھر کی مشقت کے بعد تھکی ہوئی ماں نیند میں دھت تھی۔ اس نے پیٹھ پر ہاتھ مار کے کہا'' مر باہر جا کے' باپو وہیں ہے آوے کے پاس'' دبلی پتلی چھوٹے قد کی' چھ کی بجائے محض تین چار برس کی لگنے والی' گیہوں کی سنہری بالیوں جیسی رنگت والی لڑکی' آنکھیں ملتی باہر کھلی جگہ میں آ نکلی گھپ اندھیرا تھا لیکن الاؤ کی روشنی دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ الاؤ سے خاصہ پہلے چھپر کے نیچے کئی بڑے بڑے کچے مٹکے رکھے ہوئے تھے جن کیلئے خصوصی الاؤ لگنا تھا۔ مٹکوں کے پیچھے دو آنکھیں بھی انگاروں کی طرح روشن تھیں۔ ایک مٹکے کے پاس بچی ذرا کی ذرا ٹھٹھکی ''باپو'' اس نے آواز دینی چاہی لیکن 'با' کے بعد ہی اس کا گلا ایک مضبوط گرفت میں آ چکا تھا۔ پھر بے آواز بجلی کی سی سرعت کے ساتھ وہ چراغ جیسی جلتی آنکھیں باہر کے اندھیرے میں جیسے پگھل کر معدوم ہو گئیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ماں باقی تمام رات

اطمینان سے سناتی رہی کہ بچی تو باپ کے گلے میں ہاتھ ڈال کر سونے باہر الاؤ کے پاس چلی گئی ہے۔

اس کی آدھی پونی کھائی گئی لاش بسواڑی کے پاس ملی۔ بسواڑی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں چڑیلیں رہا کرتی ہیں

کوئی سات ایک سال پہلے گاؤں کے رام بابو اہیر کی جوان' ہٹی کٹی بیوی پھول متی کو اس کے پٹی داروں نے مار کر بسواڑی میں گاڑ دیا تھا۔ رام بابو کے پاس پانچ بیگھہ زرخیز زمین تھی اور اعلیٰ نسل کی تین گائیں۔ گائیں تو فراوانی سے بچھیا بیا رہی تھیں البتہ شادی کے بارہ برس بعد بھی پھول متی نے چوہیا کا بچہ بھی نہ جن کر دیا تھا۔ رام بابو کو اس کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ وہ سارا کچھ بھگوان کے ذمہ چھوڑ کر کھیت' گئیوں اور اپنی خوبصورت عورت میں مگن تھا۔ ادھر اس کے پٹی دار اس کے یہاں اولاد نہ ہونے کی وجہ سے بہت خوش تھے۔ ان کی نیت اور اپنی کمزوری تاڑ کر پھول متی نے زبردستی رام بابو کا دوسرا بیاہ اپنی چھوٹی بہن سے کروادیا اس جرم کی پاداش میں پھول متی پر ڈائن ہونے کا الزام لگا کر پٹی داروں نے گاؤں کے اوجھا کے ساتھ سازش کر کے اسے مار ڈالا اور لاش بسواڑی میں دفن کرادی۔ تبھی انہیں بلکہ پورے گاؤں والوں کو پھل متیا کے ڈائن ہونے کا ایک اور ثبوت ملا۔ وہ بہن کی کوکھ میں آ بیٹھی تھی۔

رام بابو تو نامرد ہے۔ گاؤں کے ویدنے اس کی تصدیق کر دی تھی اور اوجھا نے بھی۔ بارہ برس اس کی پہلی بیوی اس کے ساتھ سوئی اور کچھ نہ ہوا۔ اب اس کے مرتے ہی اس کی چھوٹی بہن' جسے وہ سوت بنا کر لے آئی تھی' حاملہ کیسے ہو جائیگی؟ یا تو بچہ رام بابو کا نہیں ہے یا پھول متی پٹی داروں سے بدلہ چکانے کے لئے بہن کی کوکھ میں آن بیٹھی ہے۔ ایک دن ایک پٹی دار کی بیوی کے سر پر پھول متی کی آتما آئی جس نے بتایا کہ رام بابو تو ایسا بنجر ہے کہ اس کے بیج سے گھاس بھی نہ پھوٹے' بچے کی کون کہے یہ دراصل وہی ہے جو از خود آ گئی ہے۔ اب دیکھتے جائیں لوگ۔ وہ پھر پیدا ہوگی اور ایک ایک سے نمٹے گی۔

لوگوں نے ایک سازش رچی۔ بڑی ترکیبیں لگا کر کسی طرح پاروتی کو بسواڑی

کی طرف لے گئے۔ وہاں ایک موٹے بانس میں درمیان سے چیر لگا کر پھندا بنا رکھا تھا۔ اس کی دونوں شاخوں کے درمیان اس اٹھارہ سالہ حاملہ لڑکی کی صراحی دار گردن پھنسا کر اس طرح دبائی کہ اسکی آنکھیں ابل کر سراپا حیرت بن گئیں۔ وہ آنکھیں سوال کر رہی تھیں کیوں؟ کیوں؟

چیرے ہوئے بانس کے پھندے کے ساتھ بسواڑی میں گڈھا بھی تیار تھا۔

پھول متی کی بغل میں پاروتی بھی توپ دی گئی۔ رام بابو نیم دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ تھنوں کے دودھ سے بھرے تھن یوں ہی چھوڑ کر وہ بسواڑی کے آس پاس گھومتا پھرتا۔ پھر اسے وہاں گیتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور بانسری کی ایک اور ننھے بچے کی کلکاری بھی جو کبھی کبھی یہ بھی کہتا تھا کہ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟

اسے کسی نے پھر کبھی بیٹی دینے کی ہمت نہیں کی پٹی داروں نے اغل بغل کے گاؤں میں بھی برادری والوں سے کہہ دیا تھا کہ کسی نے بیٹی دی تو یا تو چڑیلیں اسے مار دیں گی یا اس کی کوکھ میں آن بیٹھیں گی۔ اور اب تو دو۔ دو ہیں رام بابو کو انہوں نے ہی دیوانہ بنا دیا ہے۔

ہوا بانسوں سے گذرتی تو لگتا کہ کوئی رو رہا ہے۔ اب تو کچھ اور لوگوں کو بھی وہاں غمگین گیت سنائی دیتے جیسے محرم میں دبے گائے جا رہے ہوں۔ پھول متی گیت شروع کرتی اور پاروتی بول اٹھاتی بالکل نوحے کے انداز میں پھر کوئی پپیہا پکار اٹھتا کہ پی کہاں اور بسواڑی کے پاس سے گذرنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ دھیرے دھیرے لوگ بانسوں کے جھنڈ سے دس بانس دور سے کترا کر نکلنے لگے۔ عورتیں تو شام ڈھلے ادھر ہرگز نہ جاتیں۔ اور اب بسواڑی میں ہی پھنسی کمبھ کار کی کوری ٹھلیا جیسی ننھی بیٹی کی آدھی بوٹی کھائی ہوئی لاش ملی تھی۔

چڑیلیں کچھ زیادہ ہی فعال ہو اٹھی تھیں۔

ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن کا خیال کچھ اور ہی تھا اتنے بچے اٹھے کہ اخبار اور ٹی وی شور مچانے لگے۔ ایک سرکاری ٹیم گاؤں پہنچ گئی جس میں دو شکاری بھی تھے جوان علاقوں

میں رہ چکے تھے جہاں بھیڑیے پائے جاتے تھے۔لیکن تفتیش کرنے پر اس گاؤں میں پچھلے پچاس سالوں سے بھیڑیوں کی کوئی رپورٹ نہیں ملی۔

گاؤں کے سب سے معمر بزرگ اللہ دیا نے بتایا کہ جب وہ کم عمر لڑکے تھے اس وقت گاؤں میں بھیڑیے آیا کرتے تھے بھیڑ' بکریاں' مرغیاں اٹھا کر انہوں نے کسانوں کو تباہ کرر کھا تھا۔انسانی خون تو ان کے منہ کو نہیں لگا تھا لیکن جانوروں کا اتنا نقصان ہوا کہ سرکار نے بھیڑیے مارنے پر انعام کا اعلان کر دیا۔اس وقت ایک بھیڑیا مارنے پر حاکموں سے چالیس روپے ملتے تھے جو بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔اللہ دیا کے بڑے چچا اللہ رکھا دوسری جنگ عظیم میں حصہ لے چکے تھے۔گرچہ سپلائی لائن میں تھے لیکن بندوق چلانے کی تربیت ملی تھی۔وہ اس وقت ریٹائر ہو چکے تھے مگر تھے بڑے مضبوط اور جیالے انہوں نے چار بھیڑیے مار کر ریکارڈ قائم کیا تھا۔

''اکٹھے چار''؟ کسی نے لقمہ دیا۔''نہیں۔ایک ایک کر کے۔درمیان میں مہینے دو مہینے کے وقفے سے'' ہر بار انعام پایا۔تب اسی روپے میں ایک تولہ سونا آتا تھا۔انہوں نے انعام کی رقم سے چچی کیلئے بڑھاپے میں کان کے بڑے بڑے جھومک بنوائے اور بھیڑیوں پر پیر رکھ کے تصویر اتروائی۔

چوتھے بھیڑیے کے بعد تو ڈپٹی کمشنر صاحب نے ان سے مصافحہ کیا۔

''وہ تصویریں ہیں آپ کے پاس؟ ایک شکاری نے پوچھا۔

''یار کام کی باتیں کرو'' ٹیم کے سربراہ نے کہا جو ایک کلاس ٹو سرکاری افسر تھا۔

''تصویریں تو چچی نے ایک دن غصے میں پھاڑ کر پھینک دی تھیں۔'' بزرگ چچی کے غصے کی وجوہات پر تفصیل سے روشنی ڈالنے والے ہی تھے کہ انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا گیا۔

''یہ بتایئے پھر کب بھیڑیے دکھائی دیئے تھے!''

''سن سینتالیس میں تو ایک بھیڑیا آبادی میں گھسا تھا۔شور مچا تو کئی لوگ سمجھے فساد ہو گیا۔اس وقت فضا کچھ ایسی ہی تھی۔بعد میں معلوم ہوا کہ بھیڑیا لگا تھا۔اس کے بعد

کی کوئی خبر نہیں۔"

بہت سے گاؤں والے بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص تلخی

سے بولا:

"اس کے بعد یہ ہوا تھا کہ ہماری برادری پر حملہ ہوا۔ رات کو چیخ و پکار مچی تو لوگ سمجھے بھیڑیا آیا ہے۔ آرام سے دس پچیس تیس آدمی کاٹ کے نکل گئے۔ ہماری ایک بچی اس وقت نئی بیاہی دُلہن تھیں۔ وہ کنویں میں کود گئی تھیں۔" اس کا گلا بھر آیا اور وہ خاموش ہو گیا۔

"آپ لوگ لگتا ہے ہمیں کام نہیں کرنے دیں گے۔ ہٹیے یہاں سے۔ بھیڑ ہٹائیے" وہ اس قدر رُخشے سے بولا کہ لوگ ذرا کی ذرا سہم گئے۔ جیسے بھیڑیا آ کر درمیان میں غرانے لگا ہو۔

"ہاں آپ بولیئے" وہ آواز کو قابو کر کے بزرگ سے مخاطب ہوا۔ "پھر کبھی اندر آبادی میں بھیڑیئے دکھائی دیئے؟"

"نہیں صاحب۔ بہت زمانہ ہوا۔ وہی کوئی سن سینتالیس سے پچاس کے بیچ چالیس روپے کے انعام کیلئے لوگوں نے اندھا دھند بھیڑیئے مار گرائے جنگل صاف کر دیا۔ جو بچے کھچے رہے ہوں گے وہ دم دبا کے غائب ہوئے کہ اندر ہی اندر کہیں رہ گئے۔"

"اکا دکا بھیڑیا جنگل کے اندر لکڑ ہاروں کو کبھی کبھار دکھائی دیا ہے۔ لیکن اندر نہیں آیا۔ ہوگا بھی تو اب کیوں آئے گا" ایک اور شخص خود پر قابو نہ رکھ سکا اور بول پڑا۔ وہ ایک مضبوط اور سیاہ فام آدمی تھا۔ اس نے اَنگی دھوتی پہنی ہوئی تھی اور دھوتی کے اوپر صرف بنیان۔ وہ مقامی پوربی زبان بول رہا تھا اور اسکے چہرے پر درشتگی کے آثار تھے لہجے میں بھی کچھ خشونت تھی۔ اس نے بغیر توقف کے بات جاری رکھی۔

"ایک بات سمجھ میں نہیں آتی چچا اللہ دیا۔ یہ لڑکے سب جو اٹھائے گئے وہ کمہار ٹولہ کے ہوں چاہے مانجھیوں کی بستی کے۔ میاں ٹولہ سے کوئی لڑکا آپ کی جات کا نہیں گیا۔ بکریاں بھی اٹھیں تو غریب باہمن بڑھیا کی۔ اس کا کوئی جواب ہے آپ کے پاس؟"

"بیٹوا یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں کہ بھیڑیا بھی "

''آپ نے بھیڑیا دیکھا چاچا؟'' اس نے بات کاٹ دی۔

''دیکھا تو نہیں بڑا بھگیر تھ' مگر لگتا تو صاف بھیڑیے کا کام ہی ہے نہ۔''

''ہونہہ ہماری بات کا جواب دیجئے۔ بھیڑیے نے مارا ہے یا کسی اور نے یہ تو ابھی طے ہی نہیں ہو پایا ہے۔''

''تمہاری بات کا کیا جواب دیں۔ ایسی بات تو تم نے ہی سوچی''

''آپ کیوں سوچیں گے۔'' کہہ کر اس نے ایسی ترچھی مسکراہٹ اور ترچھی نظروں سے دیکھا کہ بزرگ اللہ دیا سر کھجانے لگے۔ وہ ٹیم سے مخاطب ہوا ''آپ لوگ ہر طرح کی کھوج بین کرلیں۔ جنگل سے تین کوس اندر آ کے دھرمیندر مشر کی بکری کوئی اٹھا لے گیا۔ بکری کھونٹے سے بندھی تھی۔ اب دیکھئے نہ جانور بھی ہم ہی لوگوں کے اٹھائے جا رہے ہیں۔ سنتے ہیں اس کے دوسرے دن منجور میاں کے ہاں کئی لوگوں کا بھوج تھا۔ پلاؤ پکا۔ ہنڈے میں ماس بھونا گیا۔''

''دیکھئے آپ تو دوسری ہی بات کرنے لگے۔'' سرکاری آدمیوں میں سے ایک نے کہا' یہ گاؤں میں آپسی دشمنی یا چوری چکاری' جانور کھول لے جانے والے معاملے ہمارا مسئلہ نہیں ہیں۔ ہم لوگ آپ کا یہ زیادہ بڑا مسئلہ حل کرنے آئے ہیں۔ گاؤں میں لگاتار بچے مارے جا رہے ہیں۔''

''مگر بھیڑیے نہیں ہیں یہ سچ ہے۔'' ایک اور شخص نے وثوق سے کہا۔

''بھیڑیے نہیں تو چیتا' تیندوا' لکڑ بھگا' کچھ تو ہوگا۔ آپ لوگوں کی مدد سے ہی ہم کام کرسکیں گے۔''

''چیتا'' تیندوا ادھر کے جانور نہیں ہیں۔ بھیڑیا کہئے تو مانتے ہیں۔ مگر پچھلے پچاس برس سے بھیڑیا اندر نہیں آیا ہے۔''

''جنگل کٹ رہے ہیں' گاؤں اندر ہی اندر جنگل میں رینگتا جا رہا ہے۔ بیٹھر پہلے اتنا بڑا کہاں تھا؟'' گاؤں میں تعلیم بالغان کا سینٹر چلانے والی آشا نے کہا جو عرف عام میں نرس دیدی کہلاتی تھی اس لئے کہ اس نے مڈوائف کی ٹریننگ لے

رکھی تھی۔ لوگ بلاتے تو زچگی میں مدد کرنے کو جھٹ سے دوڑ جاتی۔

بھاگیرتھ نے اسے گھور کر دیکھا۔ چار اچھر پڑھ لئے تو سسری اپنے آپ کو پنڈتائن سمجھنے لگی۔'' وہ اس طرح بڑبڑایا کہ کم از کم آشا ضرور سن لے۔

آشا بھاگیرتھ سے بہت گھبراتی تھی۔ دراصل بھاگیرتھ سے گاؤں کے بڑے بڑے گھبراتے تھے۔ اس بے بضاعت عورت کی تو کچھ بساط ہی نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے سر پر پلو ڈال کر سینٹر کی طرف سرک لی۔

تین چار دن کی تگ ودو کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ شکاری بندوقیں لئے جنگل چھانتے رہے اور گاؤں کے باشندوں سے تفتیش' جائے واردات کا معائنہ وغیرہ کرتے رہے۔ لیکن بھاگیرتھ کا وہ ایک سادہ سا جملہ کہ کیا وجہ ہے کہ اللہ دیا چچا کی جات کا کوئی لڑکا نہیں اٹھایا گیا گاؤں میں لاگو کسی بھیڑیے کی طرح دانت نکالے' منہ سے جھاگ اڑاتا گشت کرنے لگا۔ لوگ سر ہلا ہلا کر اس نئے انکشاف پر گفتگو کرنے لگے۔

ایک عورت نے بتایا کہ جب وہ رات کے اندھیرے میں میدان جانے کو سرکنڈے کی جھاڑیوں کی طرف گئی تو پیچھے سے ایک سیاہ سایہ کود کر بھاگا تھا۔ وہ قسم کھا کر کہہ رہی تھی کہ سایہ دو پیروں پر کودا تھا اور سر سے پیر تک سیاہ لبادے میں ملفوف تھا۔

''لاجونتی بہن نے جو دیکھا اس سے تو بالکل صاف ہے کہ وہ کوئی برقعہ پوش عورت تھی۔''

برقعہ پوش عورت کی کہانی بھی گشت کرنے لگی جو بچے اٹھا رہی تھی۔

کمہار ٹولی سے نکل کر موچیوں کی بستی میں سے گزرتی وہ کہانی کائستھ باڑی میں پڑاؤ ڈالتی ٹھاکروں کی بگیا سے ہوتی باہمنوں کی امرائی میں جا کے اطمینان سے پاؤں پسار کے بیٹھ گئی۔

بھولا سنگھ نے کہا کہ پہلے وہ برقعہ پوش عورت اور بچے اٹھانے والی

وارداتوں کے درمیان کوئی تعلق نہ دیکھ پاتے لیکن ادھر ایسا کچھ ہو رہا ہے کہ انہیں بھی سوچنا پڑ رہا ہے۔ اس دن جب وہ پنچایت میں قبرستان کی چہار دیواری سے معاملے کی سنوائی کر کے لوٹ رہے تھے تو راستے میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ گبھاڑ کا نالا پار کرتے کرتے تو لگ بھگ رات ہی ہو گئی گبھاڑ کے اس پار میاں ٹولہ تھا۔ وہاں کہیں دور سے کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ ہنسی ایسی خوفناک اور منحوس تھی جیسے کوئی لگڑ بگڑ ہنسا ہو۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لیکن تبھی ایاد آیا کہ پگلا مجید یوں ہی ہنسا کرتا تھا۔ وہی ہوگا لیکن تبھی ایک برقعہ پوش عورت لپ جھپ گلی سے نکل کر پیچھے کی طرف جاتی دکھائی دی جدھر سے ایک پگڈنڈی ٹھاکروں کی بگیا میں جاتی تھی۔ برقع کی ٹوپی میں منڈھا سر ادھر ادھر کو ہو رہا تھا جیسے جلدی کی باوجود وہ اطراف کا جائزہ لے رہی ہو۔ اسی رات کو ٹھاکروں کے کھیتوں کی مڑیا میں سویا بلبھدر رکھوالے کا چھ سالہ لڑکا کھٹولی سے کھینچ لیا گیا تھا گرچہ باپ تھوڑی ہی دور آگے بڑھ کر پیشاب کرنے گیا تھا۔ وہ پوری قوت سے دوڑا لیکن تب تک ایک سیاہ سایہ اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔ کلہاڑیوں اور لوہے کی سریوں سے لیس کئی جوان کئی طرف کو دوڑے لیکن لڑکے کا کوئی پتہ نہیں چلا۔

اب لوگ میاں ٹولی کی طرف سے گزرتے ہوئے آنکھیں ٹیڑھی کر کے اشارے کرتے اور پھسپھسا کر وہاں کھڑے آپس میں باتیں کرتے۔ ٹولے کے اندر لوگ سراسیمہ ہوا تھے۔ کچھ دن پہلے قبرستان کی چہار دیواری کو لیکر جو جھنجھٹ شروع ہوا تھا وہ بڑی مشکل سے کسی بڑے واقعے میں بدلنے سے روکا جا سکا تھا۔

ٹھاکروں کی بگیا کی بڑی ٹھکرائن سنجیدگی سے سوچ رہی تھیں کہ اناج پھٹکنے اور اسی طرح کے دوسرے کام کرنے کی لئے آنے والی عیسیٰ بو کو ہٹا دیں۔ انکے رویئے میں بڑی رکھائی آ گئی تھی گرچہ عیسیٰ بو کے گھر میں کوئی عورت برقعہ نہیں اوڑھتی تھی۔ وہ گھنٹوں دھوپ میں نرائی کرنے اور ہنسیا لے کر دوسروں کے کھیتوں میں کام کرنے والی عورتیں تھیں۔ برقعہ تو بڑے گھر کی عورتوں کی عیاشی تھا۔ برقعہ

پوش عورت کی کہانی عیسٰی بو نے بھی سنی اور اس قدر خوفزدہ ہو گئی جتنا کوئی بھی ہوسکتا تھا۔ وہ خود اوسارے میں سونے لگی تھی اور بہو کو دونوں ننھی پوتیوں کے ساتھ اندر کے واحد کمرے میں سلانے لگی تھی بہو کو کڑی ہدایت تھی کہ اندر سے کنڈی لگا کر سوئے۔ بیٹا کانپور میں کپڑا مل میں کام کرتا تھا اور عیسٰی میاں کو مرے کئی برس گذر چکے تھے۔ عیسٰی بو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میٹھا بولنے والی اور وقت بے وقت بچیوں کیلئے پھل پھلاری دینے والی ٹھکرائن ایسی کیوں ہو گئی تھیں۔

تبھی بندوقیں لیکر ساکھو کے جنگلوں میں گھومنے والے شکاریوں نے ایک بھیڑیا مار لیا۔ یہ گہرے بھورے رنگ کی ایک تومند مادہ تھی۔ اس کی ماند سے بچے بھی برآمد ہوئے جو خاصے بڑے ہو رہے تھے ماند سے جو ہڈیاں برآمد ہوئیں وہ اتنی بوسیدہ اور ٹوٹی پھوٹی تھیں کہ ایک نظر میں سمجھ نہیں آ رہی تھیں لیکن قیاس غالب تھا کہ وہ انسانی بچوں کی ہی ہیں ہڈیوں کو تھیلے میں بھر کر جانچ کیلئے رکھ لیا گیا بھیڑیئے کے بچے زو بھیج دینے کیلئے پنجرے میں قید کئے گئے اور بھیڑنی کے مردہ جسم کو گاؤں میں گھمایا گیا۔ لوگوں نے چین کی سانس لی۔

ایڈمنسٹریشن کی طرف سے بھیجی گئی ٹیم فخر کے ساتھ وداع ہوئی مگر یہ سوال کئی لوگوں نے اب بھی اٹھا رکھا تھا کہ میاں ٹولے سے ایک بھی بچہ کیوں نہیں اٹھایا گیا۔ ضرور اس میں کچھ راز ہے۔ پتہ نہیں یہ بیچاری مادہ بھیڑیا بچے لے جا بھی رہی تھی یا نہیں اور اس کی ماند سے جو ہڈیاں برآمد ہوئی وہ انسانی بچوں کی تھیں یا خرگوش' ہرن' سانبھر وغیرہ کے بچوں کی۔ سرکاری لوگوں کا کیا فائل بند کرنے کو کچھ کہہ دیں۔

کوئی ہفتہ بھر بعد منسا کوری نے ٹھکرائن کے یہاں آ کر کہا کہ ادہر کے کھیت میں کل شام گھراتے وقت اس نے ایک سیاہ سایہ لپکتا دیکھا تھا۔ ڈر کے مارے اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا' ناک کی سیدھ میں بگٹٹ بھاگا تو بگیا کے کنویں کی جگت پر آ کر دم لیا۔

عیسیٰ بوا اس وقت سر جھکائے گھر گھر چکی پر ماش دل رہی تھیں۔ امید تھی کہ ٹھکرائن آج نہیں چونی ضرور دیں گی۔ چونی کی روٹی مزیدار ہوتی ہے۔ اور پیٹ میں دیر تک ٹھہرتی بھی ہے۔ لیکن ٹھکرائن نے تو ایک سنگدل بے نیازی کے ساتھ دلی ہوئی دال مٹکے میں ڈال دی اور اور عیسیٰ بو سے بولیں ''کل کیا کی سانی کرتے وقت چونی اس میں ڈال دینا''

کوئی دو مہینے گزر گئے۔ نہ کوئی بچہ مارا گیا نہ کسی کی بھیڑ بکری چوری ہوئی۔ لوگ اب بھیڑیے کی باتیں کم کرنے لگے تھے۔ کچھ کو تو پورا یقین بھی آ گیا تھا کہ اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کیلئے وہ بھوری بھیڑنی انسانوں کے بچے مار رہی تھی۔ خیر وہ تو جانور تھی۔ اپنا مطلب پورا کرنے کو انسان اپنے جیسے انسانوں کو مارنے میں کونسا تامل کرتے ہیں۔ آخر پٹی داروں نے رام بابو کی دو دو بیویوں اور ساتھ میں پیٹ کے بچے کو مار دیا تھا نہ۔ کوئی بولے نہ بولے پولس کچھ کرے نہ کرے جانتا تو سارا گاؤں تھا اور یوں خوبصورت جوان عورتوں کو عمر پوری ہونے سے پہلے مار دیا جائے تو ڈائن چڑیل تو بنیں گی ہی یہ بھی سارا گاؤں مانتا تھا۔

لیکن بھورے مادہ بھیڑیے کے مارے جانے کے بعد کوئی تیسرا مہینہ لگا تھا کہ حد ہی ہوگئی۔

گاؤں میں بیت الخلاء شاذ و نادر ہی کسی کے گھر تھا۔ عورتیں خاص طور سے منہ اندھیرے کھیت میدان جاتیں۔ اکثر تو تاروں کی چھاؤں میں یہ کام انجام دیا جاتا۔ سکھ رام پنڈت کی نئی بہو کا پیٹ خراب ہوگیا تو اسے سر شام جانا پڑا۔ بارہ بجے رات کو پھر مروڑ اٹھی تو اس نے شرم سے پاس پڑے شوہر کو نہیں اٹھایا۔ وہ کوئی بچہ نہیں تھی۔ مضبوط ہاتھ پاؤں کی انیس برس کی کسان گھرانے کی بیٹی تھی اس نے پاؤں سے پائل نکالی اور ہاتھ سے چوڑیاں کہ آواز نہ ہو اور دھوتی سنبھالتی' ناک کی تھنی درست کرتی سرکنڈوں کے پیچھے چلی گئی۔ سناٹا سن سن کر رہا تھا۔ لیکن پورے چاند کی رات تھی' سحر انگیز چاندنی سرکنڈوں پر پھیلی پڑی تھی۔ دراصل چاندنی نے

ہی بڑکی کے اندر ڈر پیدا نہیں ہونے دیا تھا۔ حسب دستور چڑیوں کی چہچہاہٹ سے لڑکا جاگا۔ بیوی بغل میں نہیں تھی وہ اندھیرے میں ہی 'دشا میدان' کیلئے نکل لیتی تھی لیکن اس کی پائل اور چوڑیاں بستر پر رکھی دیکھ کر اسے کچھ حیرت ضرور ہوئی۔ سورج پورا اُگ آنے پر بھی نہیں لوٹی تو لوگ دوڑے۔ سرکنڈے کی جھاڑیوں میں لٹیا الٹی پڑی تھی اور کچھ دوری پر بڑکی کی لاش جس کی ران کا بڑا حصہ کھالیا گیا تھا۔

کسی بالغ کے چاندنی رات میں مارے جانے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔

''بھیڑیا تو مار لیا گیا تھا۔ پھر اب یہ کون؟''

''اور بھیڑیے بھی تو ہو سکتے ہیں۔''

''یہ بھیڑیوں کا گڑھ نہیں ہے'' کسی نے نہایت غصے سے کہا سن سینتالیس اڑتالیس کے بعد سے بھیڑیئے یہاں کبھی نہیں گھسے۔''

''بھیڑیئے نے نقصان اس بار بھی 'ہمارا' ہی کیا ہے۔''

''ہاں یہ سوچنے کی بات ہے۔ کب تک ہم آنکھیں بند کیے رہیں گے۔؟''

ہنسا کا جواب ہنسا سے دینا بہت ضروری ہے۔ ہم ہندوؤں کی یہ بڑی کمزوری رہی ہے کہ ہم بے انصافی اور ہنسا کو امرت کی گھونٹ کی طرح گٹک جاتے ہیں' ٹھنڈی سانس تک نہیں بھرتے۔''

''نہیں جی۔ اب پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے۔ یہ سرکاری لوگ کچھ نہیں کریں گے۔ ایک بے قصور بھیڑنی کو مار گئے۔ بیچاری کے چھوٹے چھوٹے بچے اٹھا کے چڑیا گھر بھیج دیئے۔ وہ عمر قید جھیلیں۔ کیسا گھور انیائے ہے۔ رام رام رام۔''

جوان لڑکی کی لاش کے پاس سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا تھا۔ عیسیٰ بوآس پاس تھیں۔ اوڑھنی سر پر برابر کرتے ہوئے انہوں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں سر ہلایا اور بولیں ''ہماری اماں کہتی تھیں' کھائے تو بھیڑیئے کا نام' نہ کھائے تو بھیڑیئے کا نام۔''

''اس بڑھیا کا گلا تو پہلے دن ہی ریتنا چاہئے۔ پچھلے سال رام نومی کے

جلوس میں اس کا بیٹا گڑ کا شربت لیکر کھڑا ہوا تھا۔منہ میں رام بغل میں چھری۔ گاؤں کی چوپال میں ہم روز شام کو اخبار پڑھنے جاتے ہیں ہمارے گاؤں کے بارے میں نکل رہا ہے کہ یہاں پڑوسی ملک کی خفیہ ایجنسی کے لوگ گھوم رہے ہیں۔ انہیں لوگوں کے بل بوتے پر گاؤں کے اندر گھسے آ رہے ہیں نہ وہ۔کہیں ٹھور ٹھکانہ نہ بن سکے تو کیسے آئیں گے؟"

عیسیٰ بو کی سمجھ میں پھر کچھ نہیں آیا۔نہ پڑوسی ملک نہ خفیہ ایجنسی۔کم عقل ہونے کے ساتھ وہ تھوڑی بہری بھی تھیں۔کچھ دیر تک ہونقوں کی طرف کھڑی رہ کر سٹرپٹر کرتی اپنے کام پر چل پڑیں۔مگر دل میں کہیں بے چینی تھی۔لوگوں کی باتیں سمجھ میں نہیں آئیں لیکن کہیں کچھ تھا جو الفاظ سے پرے تھا اور وہ جو تھا وہ بہت اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

لیکن عیسیٰ بو کا گلا ریتے جانے کے منصوبے پر عمل درآمد ہونے سے پہلے ایک عجیب واقعہ اور ہو گیا۔اب کی چوبیس گھنٹوں کے اندر دو بچے اٹھائے گئے او دونوں میاں تو لے کے۔

مہوے کے موسم میں مہوا بین کر اور جاڑوں میں تالاب سے سنگھاڑے نکال کر گذر بسر کرنے والے عبدل کی سات آٹھ سالہ لڑکی شام کو اپنی ماں اور دوسری عورتوں کے ساتھ گھاس گڑھ کر لوٹ رہی تھی۔اسی دن اسے ہلکا بخار تھا جو شام ہوتے ہوتے بڑھ گیا۔وہ ہولے ہولے چل رہی تھی اور برابر ماں سے اپنی سست رفتاری کیلئے ڈانٹ کھا رہی تھی۔اندھیرا بڑھ رہا تھا اور ہوا میں خنکی تھی۔ آموں کے جھنڈ کے پاس پہنچنے پر اچانک لڑکی پیچھے سے کھینچ لی گئی۔عورتوں نے پلٹ کر چیخ پکار مچائی تو جانور لڑکی چھوڑ کر بھاگ نکلا لیکن نرخرہ دبائے جانے سے اور شاید شدید صدمے کے تحت وہ مر چکی تھی۔

دوسرے ہی دن مختار ن بی بی پر حملہ ہوا اور وہ بھی دن دہاڑے جو کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

مختارن بی بی کمر پر بچہ اور سر پر ٹوکری لئے چلی جا رہی تھی ۔ گاؤں میں خوف کا ماحول ہونے پر بھی زندگی اپنی رفتار سے چل رہی تھی ( اور خوف اب کہاں نہیں ہے ) پھر یہ کہ دن کا وقت تھا جلاون کیلئے پگڈنڈی سے گذرتے جانوروں کا گوبر بینتے بینتے وہ بسواڑی کے پاس چلی آئی تھی ۔ اچانک بانسوں کے جھنڈ سے ایک موٹا تازہ بھیڑیا اس پر حملہ آور ہوا اور چشم زدن میں گود سے بچہ جھپٹ کر بجلی کی طرح بسواڑی میں تحلیل ہوگیا ۔ مختارن بی بی کے بازوؤں اور پسلیوں کے پاس اس کے پنجے سے گہری خراشیں بھی آئیں شام تک بچے کے کچھ باقیات بسواڑی سے کوس بھر آگے کے بیہڑ سے برآمد ہوئے ۔ پہلی بار کسی نے دن کی روشنی میں حملہ آور کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس کی شناخت کی تھی ۔ وہ بھیڑیا ہی تھا نر کہ مادہ اس کی پہچان تو پل بھر میں نہیں ہوسکی لیکن وہ ایک نہایت سیکولر بھیڑیا تھا ۔

وہی کیوں بھیڑیے تو سبھی سیکولر ہوتے ہیں شکار کا مذہب کبھی نہیں پوچھتے ۔

# مچھندر کی واپسی

تب مچھندر چمپارن کے ایک گاؤں میں ایک پاسی کے یہاں پیدا ہوئے تھے۔ مچھندر کی دادی دائی جنائی کا کام کرتی تھی اس لئے بہو کی زچگی اس نے خود کرائی تھی۔ بہو کی کمر کے نیچے اس نے راکھ کی ایک موٹی پرت بچھادی تھی تا کہ زچگی کے دوران باہر آنے والی آلائش کو سمیٹنا آسان ہوجائے ورنہ جھونپڑے کے کچے فرش میں جذب ہو کر کیچڑ بنادے گی۔ ویسے بھی زچگی ہونے پر زچہ کے ساتھ پورا گھر ناپاک ہوجاتا تھا۔ یہاں تک کے طاقچے پر رکھے دیوتا بھی۔ اس لئے جب تک عورت نہانہ لے، پوجا بھی ملتوی رہا کرتی تھی۔

تو مچھندر راکھ پر پیدا ہوئے۔ ایک تو ویسے ہی تمباکو کا پنڈا تھے اس پر سے جسم پر لگے سیال پر راکھ لپٹ گئی دادی نے ایک گندی کھرپی سے نال کاٹ کر انہیں ماں سے الگ کیا، پھر کیلے کے پتے سے پونچھ پونچھ کے انہیں صاف کیا۔ مچھندر بڑا مضبوط جسم لے کر آئے تھے۔ انہیں ٹٹنس نہیں ہوا جیسا کہ ان سے پہلے پیدا ہونے والے ایک بھائی اور ایک بہن کو ہو گیا تھا اور دادی نے کہا تھا کہ بہو شام کے وقت شمشان میں لکڑیاں اور سوکھے پتے چننے جاتی رہی تھی اس لئے کسی بدروح نے اس کے بچوں پر سایہ ڈال دیا تھا۔ اس مرتبہ دادی نے اوجھا سے تعویذ لیا تھا۔ ساتواں مہینہ شروع ہونے پر وہ بہو کے پیٹ پر باندھ دیا گیا تھا۔ زچگی کے وقت دادی بہو کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر خود بھی زور دیتی۔ دیوتاؤں کی دہائی دیتی جاتی تھی اور بیچ بیچ میں کرخت آواز میں بہو کو ڈانٹتی بھی جاتی تھی کہ وہ ذرا جلدی کرے اور بیٹا ہی پیدا کرے۔ بیٹا تو خیر سب کو چاہئے ہوتا ہے لیکن جلدی کرنے کی بات یہ تھی کہ چند دن پہلے

گاؤں کے بنیے کے یہاں بھی زچگی ہوئی تھی اور مجھندر کی دادی سماری وہاں زچہ کی مالش کرنے جاتی تھی۔ دیر ہو جاتی تو ڈانٹ پڑنے کا ڈر تھا۔ بنیے کا پختہ گھر خاصی دور بھی تھا اس لئے کہ چمار پاسیوں کی بستی گاؤں کے بالکل آخری سرے پر تھی۔

جلدی جلدی بھاگنے سے پہلے سماری نے چمٹا لے کر المونیم کی تھالی بجائی۔ پوتا جو ہوا تھا۔

بہو نے کروٹ لی اور کمزور آواز میں بولی۔ ''بچ جائے تب نہ اماں''

''اری چپ رہ کل جبھی۔ دو بچے کھا گئی۔ تیسرے میں بھی اپ شگن بولتی ہے۔'' سماری نے بہو کو ڈانٹا پھر آدھے گھنٹے کی زچہ کو نوزائیدہ بچے کے ساتھ تنہا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تھوڑا تو اور رک جا اماں۔'' بہو نے پیچھے سے پکارا۔ ''بہت کھون جا رہا ہے شریر سے''

''پڑی رہ چپ چاپ۔ پہلا بچہ جنا ہے کیا جو کھون جانے سے ڈر رہی ہے۔ آتے ہیں مالش کر کے۔ گڑ مانگ کے لائیں گے۔ شربت گھول کے پئے گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''بچے پہ کپڑا تو ڈالتی جاؤ اماں۔''

''ارے ساہوکار کی جنی۔ تیرے باپ نے کپڑا بھیجا ہے کیا'' سماری بہڑ بڑ کرتی باہر نکل لی اور تیز تیز قدموں سے چلتی نظروں سے اوجھل ہو گئی کہ کہیں بہو پھر نہ پکارے۔ اور پکارے تو پکارے کہیں بچے کو کپڑے میں لپیٹنے کی ضد نہ کرے۔ وہ نعمت غیر مترقبہ۔ وہ ایک سنگل چادر جو سماری کے حصے میں آئی تھی جب ٹولی اس کے دروازے پر رکی تھی۔

مجھندرا اور مجھندر کی سولہ سالہ والدہ جن کی وہ تیسری اولاد تھے اور ابھی پیٹ میں تھے، اور مجھندر کی چالیس سالہ دادی تاریخ کا ایک حصہ تھے جس کا انہیں علم بھی نہیں تھا۔

ان کے دروازے پر ٹولی رکی تھی۔

کچھ دن پہلے چمپارن میں گاندھی بابا آئے تھے۔ پورے ملک میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ انگریز نیلہے کسانوں پر بڑا ظلم کر رہے تھے۔ مجھندر کا نوجوان باپ دس کوس کی مسافت طے کر کے گاندھی بابا کی میٹنگ میں ہو کر آیا تھا۔ وہاں اسے معلوم ہوا تھا کہ گاندھی بابا اس کی

ذات کے لوگوں کو اچھوت نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ تو کسی کو بھی اچھوت نہیں سمجھتے۔ وہ اوران کے ساتھی نیچی ذات کے لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے تک ہیں۔ انہوں نے اچھوتوں کو ہری جن نام دیا ہے۔ ہری جن یعنی ہری کی اولادیں۔ بھگوان کے بچے۔ گاندھی بابا کے لوٹ جانے کے بعد کچھ لوگ رک رہے ہیں جو گاؤں گاؤں کا دورہ کریں گے، لوگوں کو اچھی اچھی باتیں سکھائیں گے۔ چھوا چھوت تو خاص طور پر دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

''اس سے کیا ہوگا؟'' مچھندر کے باپ نے سادہ لوحی سے سوال کیا تھا۔

گاندھی بابا کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہونے والے اس ٹھاٹھیں مارتے ہجوم میں ایک شخص ان کا مخالف بھی تھا۔ وہ مچھندر کے باپ کی بغل میں ہی کھڑا ہوا تھا۔

''کچھ نہیں، تم سب کے سب حرامی کہلاؤ گے۔ رنڈیاں رام جنی کہلاتی ہیں اس لئے کہ ان کے باپوں کا پتہ نہیں ہوتا۔ اب یہ گاندھی بابا کے ہری کے جنے، ان کے ساتھ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ ان کے صحیح باپ کا پتہ نہ ہو۔ ان کے رتبے میں یہ لنٹیا والے بابا کون سا اضافہ کر رہے ہیں۔''

وہ شخص خالص کھڑی بولی بول رہا تھا۔ اس لئے چمپارن کی بھوجپوری کے علاوہ اور کوئی زبان نہ بولنے والے مچھندر کے باپ کی سمجھ میں کچھ آیا، کچھ نہیں۔

''اچھوتوں اور مسلمانوں کو سر چڑھاؤ۔ تمہیں تو ہم دیکھ لیں گے۔ ابھی ذرا ان گوروں کو نکال لیں۔'' مزید بڑبڑاتا ہوا وہ شخص وہاں سے چل دیا۔

وہ لوگ سچ مچ مچھندر کے گاؤں آئے۔ ان میں دو ایک مسلمان تھے، کچھ نیچی ذات کے اچھوت سمجھے جانے والے اور چار اونچی ذات کے ہندو تھے۔ وہ سب ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے اپنی تھالی۔ گلاس خود مانجھ لیتے تھے جو انہوں نے ایک جھولے میں ڈال رکھے تھے۔ کسی نے کچھ کھانے پینے کو دیا تو بلا امتیاز خوشی خوشی قبول کر لیتے تھے۔ ایک وقت انہیں بابو صاحب کے گھر کھانا دیا گیا۔ چند دن پہلے ہی بابو صاحب کے کارندوں اور رشتے داروں نے مچھندر کے باپ کو کیلوں جڑے جوتوں سے پیٹا تھا اس لئے کہ اس نے کھیت پر کام کرتے وقت چپکے سے پاس چرتی گیا کا دودھ دونے میں دوہ کر پی لیا تھا۔

کھانا کیلے کے پتل پر پروسا گیا۔ شیشے کے گلاسوں میں پانی دیا گیا۔ جب لوگ چلے گئے تو وہ سارے گلاس پھوڑ دیے گئے جن میں ان لوگوں نے پانی پیا تھا۔ او سارا گائے کے گوبر سے لیپا گیا اور ایک بڑے کلسے میں لایا گیا گنگا جل چھڑک کر اسے پاک کیا گیا۔ بڑے ٹھاکر بولے۔ ''آزادی کی لڑائی میں ہم گاندھی کے ساتھ ہیں لیکن ''ان لوگوں'' کو اتنا سر چڑھانا ہمیں بالکل پسند نہیں۔ سماج کے لئے یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ ابھی لوگ آزادی کی دھن میں اس پر بچار نہیں کر رہے لیکن بعد میں پتہ چلے گا۔''

زبان میں تو چھوت اچھوت ہوتا نہیں۔ بابو صاحب لوگ بھی خالص بھوجپوری ہی بولتے تھے اس لئے مچھندر کے باپ کی سمجھ میں بڑے ٹھاکر کی ایک ایک بات آ رہی تھی۔ لیکن اسے اچھوت نہ سمجھے جانے میں کسی خاص فائدے کی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگر اسے اچھوت نہ بھی سمجھا گیا لیکن گیا کا ایک پاؤ دودھ پی لینے پر کیلوں جڑے جوتوں سے زمین پر گرا گرا کر روندا گیا تو مطلب کیا ہوا گاندھی بابا کی تعلیم کا۔ اس نے تو خود اپنے مرتبے کو صدیوں بلکہ ہزاروں سال سے قبول کر رکھا تھا۔ اس کا کنواں الگ تھا۔ اس کے دیوتا الگ تھے۔ اس کی بستی الگ تھی۔ بس دونوں وقت کھانا ملتا رہے۔ اس کی بہن کی کوکھ میں جس نے زبردستی بیج ڈالا تھا اس کا پتہ چل جائے۔ اسے سزا مل جائے۔ باقی تو جب پچھلے جنم کے کرموں کے پھل میں بھگوان نے اسے پاسی کے گھر پیدا کیا تھا تو اپنی اوقات میں رہنے اور بابو صاحب لوگوں کی سیوا کرنے میں اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ابھی تو اگر اس سے کہہ دیا جاتا کہ وہ بابو صاحب لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر ایک پنگت میں کھانا کھائے گا یا کوئی بابا جی اس کے کنویں سے اس کے ہاتھ کا کھینچا پانی لے کر پئیں گے تو وہ وہیں کھڑا کھڑا مارے دہشت کے مر کر گر جاتا۔ لیکن اسے معلوم ہوا تھا کہ وہاں جو لوگ آئے تھے ان میں جو نیچی جات والا تھا وہ موچی تھا، ایک مسلمان سجن تھے۔ ان کی چھوٹی خشخشی داڑھی تھی۔ داڑھی ویسے وہ لالہ جی بھی رکھے ہوئے تھے جو ٹولی میں شامل تھے۔ سب ایک جیسے لگ رہے تھے معمولی لیکن صاف ستھرے کپڑے، چہروں پر سکون اور نرمی۔ سب کی پہچان ہی مٹا دیں گے کیا گاندھی بابا؟

وہ خشخشی داڑھی والے کائستھ نوجوان کنوارے تھے۔ گاندھی بابا کے ساتھ ہو لئے تھے۔ سوچتے تھے شادی کر کے کسی کی بیٹی کو کیوں مصیبت میں ڈالیں۔ کیا پتہ کب جیل چلے جائیں یا گولیوں سے بھون دیئے جائیں۔ کچھ نہیں تو روزی روٹی پر تو اثر پڑے گا ہی۔ ان کی اماں روز ان کے ساتھ کھانا کھاتی تھیں۔ شوہر کو پنکھا جھل جھل کے پہلے کھلا دیتیں۔ بیٹے کے ساتھ خود بیٹھتیں پنکھا ایک ہاتھ سے انہیں بھی جھلتی جاتی تھیں۔ مہری گرم پھلکے تھال میں ڈالتی جاتی تھی۔

'منا' کا مونہہ دیکھ دیکھ کر جینے والی اور سہرے کے ارمان سنجونے والی اماں کو معلوم ہوا کہ منا چمپارن میں نیل کچھیا گئے تھے۔ وہاں مسلمانوں اور چمار پاسیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔ چائے پی تھی۔ ایک موچی ساتھ تھا۔ وہی تھیلے میں رکھے تھالی، کٹورے لٹیاں مانجھتا تھا۔ کبھی لوگ اپنے اپنے برتن خود بھی مانج لیتے۔ اس دن پہلی بار ایسا ہوا کہ اماں ساتھ کھانے نہیں بیٹھیں۔ ان کے 'منا' مرتنجے شری واستو نے اکیلے ہی کھانا کھایا۔ اماں نے کہا تھا ان کا پیٹ خراب ہے۔ پھر کئی دن پیٹ خراب رہا تو منا کا ماتھا ٹھنکا۔ وکیلوں والی جرح پر اتر آئے تو سیدھی سادی اماں مزید چالاکی نہ برت پائیں۔

"ارے تو مسلمانوں کے ساتھ کھاتا پھرتا ہے۔ حد تو یہ ہوگئی کہ چمپارن میں ایک پاسی کے گھر چوکھا بنوا کے کھایا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔

مرتنجے شری واستو نے ایک طویل سانس کھینچی۔ اس تفصیل میں جائے بغیر کہ اماں کو یہ سب کس نے بتایا اور کیوں بتایا بولے اماں آج سے ہم دانے کو ہاتھ نہیں لگائیں گے جب تک تم ساتھ نہیں بیٹھو گی۔ اور ہاں جو چاہو کرلو، ہمارے سامنے رونا مت ورنہ چوکھٹ سے سر پھوڑ لیں گے۔

جھولا سنبھال کر ایک موچی اور ایک مسلمان ساتھی کو لے کر مرتنجے شری واستو پھر گھر سے نکل لئے۔ اماں نے ڈر سے ساتھ کھانا شروع کر دیا لیکن گھر میں آنے سے پہلے انہیں نہا کر کپڑے بدلنے ہوتے تھے تب گھر میں داخلہ ملتا تھا۔ نہانے کا انتظام باہر نل پر تھا۔ اماں نے ایک تھالی میں کھانا بھی بند کر دیا تھا۔ ساتھ بیٹھتیں لیکن تھالی الگ لگتی۔ منا نے بھی

سوچ لیا کہ چلو ماں کی روایات کی اتنی پاسداری کر لی جائے۔ ان کی منطق کے سامنے انسانی مساوات کے سارے لیکچر جھوٹے ہو جاتے تھے:

''اب شاستر جھوٹے تو نہیں ہیں۔ پہلے جنم کے کرموں کے پھل سے جون طے ہوتی ہے۔ تو بھی تو باہمن کے گھر نہیں پیدا ہوا۔ لالہ کے گھر جنما اور ہم کسی کا برا تھوڑی ہی چاہتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہتے کہ مسلمان کا سر پھوڑ دو چمار سیار ہے تو بھوکا مارو۔''

''اب اماں برا چاہو نا چاہو، حقیر تو جانتی ہی ہو۔''

''ہم کیوں جانیں گے حقیر۔ کرم پھل ہے، بھگوان نے ویسا بنا کے بھیجا۔''

اب جہاں بھگوان درمیان میں آ جائیں وہاں انسان کی کیا چلے۔

گاندھی بابا چمپارن میں کئی مہینے رہے اور بہت کچھ کر گئے۔ گاؤں میں طبی مرکز کھلوائے، اسکول قائم کیے، کستور با بھی ساتھ تھیں۔ ان کی مدد کے لئے خواتین کا پورا گروپ تھا۔ ان سب نے گاؤں کے لوگوں کے ساتھ مل کر بجبجاتی گندگی صاف کی۔ فارغ ہونے کے بعد فضلے کو مٹی سے ڈھکنے اور مٹی یا (مقدور ہو تو) صابن سے ہاتھ دھونے کا سبق پڑھایا۔ ایک جوش کا عالم تھا کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ بچے ان کے ساتھ خوشی خوشی نکل لیتے۔ بیلچے ہاتھ میں لے کر بغیر کھائے پیئے دن بھر کام کرتے۔ خواتین نے ان بچوں کو بھی سمجھایا: کھانے سے پہلے اور شاید ان کے بعد ہاتھ اچھی طرح دھو لینے چاہئیں۔

کھانا ہاں کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔ لیکن کھانا تھا کہاں جسے وہ خواتین 'روٹی' کہتی تھیں اور مچھندر 'بھات' کہا کرتے تھے۔

گاندھی بابا لوٹ گئے۔ دھیرے دھیرے گاؤں بھی اپنی پہلی حالت پر واپس لوٹ آئے۔ اسکولوں میں لوگوں کا جانا بند ہو گیا۔ اب نہ لڑکے تھے نہ ٹیچر۔ میڈیکل سنٹر بھی کچھ دن لولے لنگڑے چل کر بند ہو گیا۔

مرتجے شری واستو کی ماں فصیح اردو میں کہا کرتی تھیں ،علت جائے دھوئے دھائے، عادت جائے دم کے ساتھ۔ گندگی اور جہالت گاؤں کے لوگوں کی عادت بن گئے تھے اور سب کی جڑ میں تھی غربت۔ کتنا پیچ در پیچ دائرہ تھا یہ۔ کیسی گتھیاں تھیں جو سلجھانے کے

لئے نہ جانے کتنی زندگیاں درکار تھیں۔ ملک کی آزادی کے لئے تو لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ان بھوتوں سے کب آزادی ملے گی؟ مرتجے عرف منا کے ساتھی علی حسن نے بڑے تاسف کے ساتھ کہا تھا۔

مچھندر اس وقت کوئی آٹھ ایک سال کے ہو گئے تھے۔ سارا جوش جب اوس کی بوندوں کی طرح اڑنے لگا تھا تبھی ایک واقعہ ہوا۔ تالاب سے سنگھاڑے نکالتے وقت سنگھاڑے کی بیلوں میں الجھ کر ڈوب جانے سے مچھندر کے باپ کی موت ہو گئی۔

مچھندر کی والدہ ایک متمول کسان کے گھر ڈھیکی میں دھان کوٹ کر چاول الگ کرنے کا کام کرتی تھیں۔ اب مچھندر بھی ان کے ساتھ جا کر ڈھیکی میں دھان کوٹنے کا کام کرنے لگے۔ انہیں دنوں ایک نلہے صاحب مچھندر کے مالک کے گھر آئے۔

نلہے صاحب اب لگ بھگ ختم تھے۔ چمپارن میں نیل کی کھیتی کرانے اور کسانوں پر ظلم توڑنے والے انگریزوں کی اس جماعت کا کاروبار جرمنی سے آنے والے مصنوعی نیل کی وجہ سے ٹھپ ہو گیا تھا۔ ظلم کے اس باب نے خود بخود آنکھیں بند کر لی تھیں۔ لیکن ظلم کبھی بند نہیں ہوتا ہے نہ کبھی مرتا ہے اس نے دوسرے باب کھول لئے تھے۔ ادھر آزادی کی جدوجہد نئے زاویے پکڑ رہی تھی۔

مچھندر کے مالک نے اپنے گورے مہمان / آقا کے حکم بصورت درخواست پر مچھندر کو طلب کیا۔

چمپارن میں کھلے میدان میں چھولداریاں لگ رہی تھیں۔ وہ میدان بعد میں گاندھی میدان کہلایا۔ اس وقت تک صرف میدان تھا۔ لاٹ صاحب دورے پر آرہے تھے۔ ڈرے سہمے مچھندر، ان کی والدہ اور دادی کو مچھندر کے مالک نے سمجھایا کہ گاؤں سے اور بھی لڑکے جا رہے ہیں۔ ویسے بھی کام عارضی ہے گورے خوش ہوتے ہیں تو انعام و اکرام کی بارش بھی کر دیتے ہیں۔

اس وقت تک مچھندر کے چار بہن بھائی اور پیدا ہو چکے تھے جن میں سے دو پرانی روایت قائم رکھتے ہوئے مر گئے تھے اور دو بچ رہے تھے اور علی الترتیب سات و تین سال

کے تھے۔ مچھندر کے گھر میں جو بچ جاتا اسے اپنی روٹی (چمپارن میں 'بھات') خود کمانی ہوتی۔ مچھندر پانچ سال کی عمر سے ہی کھیت کٹ جانے کے بعد سلا بینتے۔تالاب سے گھونگے پکڑتے۔ برسات میں گڈھوں سے مچھلیاں چھان لاتے۔ مالک کی گارنٹی پر اب انہیں گورے صاحب کے ساتھ بھیج دیا گیا۔گاؤں سے شہر ہی تو جانا تھا کون ساسات سمندر پار جانا تھا۔

ہیڈکوارٹر میں مچھندر کو ایک سینئر ہندوستانی خدمت گار کے سپرد کیا گیا جس نے انہیں نہانے کے لئے صابن' بدن پونچھنے کے لئے تولیہ اور پہننے کے لئے قمیض اور ہاف پینٹ دیئے۔ یہ کپڑے نئے تھے۔ مچھندر انہیں بے یقینی کے عالم میں چھو چھو کر دیکھا کرتے۔رہنے کا انتظام بھی اس کی کوٹھری میں تھا وہ بڑی شفقت سے انہیں 'بوا' کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔دل میں امنڈتے آنسو پونچھ کر اپنے اس نئے اوتار میں مچھندر اپنے کام میں تندہی سے جٹ گئے۔ ان کا کام تھا چھت سے لگا بڑا سا پنکھا ہلاتے رہنا۔ ان کے 'گاڈفادر' بندے علی نے بتادیا تھا کہ جب تک ڈیوٹی، پر رہیں نہ ہاتھ رکے نہ پلک جھپکے۔ جب لاٹ صاحب آئیں گے تو ان کے خیمے میں ڈیوٹی دی جائے گی۔

''بوا' واپس کب آئے گا؟''

کافی دن گذر گئے تو دھان کے پولے ڈھیکی میں ڈالتے ہوئے مچھندر کی فکر مند ماں نے ڈرتے ڈرتے مالک سے سوال کیا۔

''تم خوش قسمت ہو۔'' مالک نے جواب دیا۔'' ہم بتانے ہی والے تھے۔ تمہارے لڑکے کا کام صاحب کو اتنا پسند آیا کہ لاٹ صاحب گئے تو نیلہے صاحب نے اسے اپنے یہاں لگا لیا ہے۔فکر مت کرو کچھ روز میں تمہارے لئے کچھ روپیہ بھی آجائے گا۔''

''مگر بوا!؟''

''وہ بھی آئے گا۔کچھ دن بعد چھٹی ملے گی نہ۔''

ماں کا دل پھر بھی دھک دھک کرتا رہا۔ کیا جانے کیسا ہوگا۔صاحب لوگ تو مشہور تھے۔ہنٹر سے کسانوں کی پٹائی کیا کرتے تھے۔گھوڑا دوڑا کر انسانوں کو روند دیتے تھے۔

''اب وہ نلہے نہیں رہ گئے ہیں۔ نیل کی کھیتی کتنی کم ہوگئی ہے۔ سنتی نہیں ہے پاگل کہیں کی۔ بس نام پڑ گیا۔ اس لئے نلہے کہلاتے ہیں۔ ان کی کوٹھیاں بھی نلہی کوٹھی ہی کہلاتی ہیں۔ اب نہ نیل ہے نہ ظلم۔''

'صاحب لوگ تو وہی ہیں نہ' مچھندر کی ماں نے سر ہلایا لیکن خاموش رہی اور دھان کوٹتے ہوئے بیٹے کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

انہیں دنوں مچھندر کی دادی نے وہ خوفناک کہانی سنائی۔

پرانے زمانے میں، یا کسی زمانے میں، چمپارن کے گاؤں میں ایک عورت تھی جو اناج کی بالیں کوٹ کر دانے الگ کیا کرتی تھی۔ اس کا شوہر روزی روٹی کمانے پردیس گیا تھا۔ (ہوسکتا ہے شوہر نہ رہا ہو، بیٹا ہی ہو) ایک دن وہ واپس آیا اور دروازے پر دستک دینے لگا۔ عورت برہ کے گیت گاتی، اناج کوٹنے میں ایسی مصروف رہی کہ اسے وہ دستک سنائی نہیں دی۔ وہ لوٹ کر چلا گیا اور ایسا گیا کہ پھر واپس نہ آیا۔ دکھیاری عورت احساسِ جرم میں جلتی جلتی آخر دنیا چھوڑ گئی۔ پھر اس نے ایک چڑیا کی جون میں جنم لیا جو ہر وقت گاتی تھی۔ کوٹوں تھی، پیسوں تھی، آیا تھا، گیا تھا۔

واقعی ایک چڑیا تھی جو اکثر دوپہر کے سناٹے میں گاتی تو یہی غم زدہ بول سنائی دیتے اور مچھندر کی ماں کی ریڑھ کی ہڈی میں سردلہر دوڑ جاتی۔ پھر ایسا ہوا کہ اسے ہر چڑیا کے گیت میں یہی بول سنائی دینے لگے۔ کوٹوں تھی، پیسوں تھی۔ اس کا شوہر تو تھا نہیں، بھاگ سہاگ اسی بیٹے سے تھا۔ پھر وہ دل کو سمجھاتی کہ اس کی جھونپڑی اتنی چھوٹی سی ہے کہ اس میں دستک دینے کی ضرورت ہے نہ کنڈی کھڑکانے کی (کنڈی تو ہے بھی نہیں) اس میں تو تتلی اڑ کر آئے تو اس کے پروں کی آہٹ تک مل جائے گی۔ اس کا بیٹا واپس کیسے جاسکتا ہے۔

ایک ڈیڑھ مہینے کا عرصہ اور گذر گیا۔ اس درمیان چمپارن سے پانچ روپئے آئے اور کیلے کی ایک گود۔ پھر ایک دن مچھندر بھی واپس آ گئے۔ کالے کلوٹے، مریل سے گئے تھے۔ اب جسم پر گوشت چڑھ گیا تھا۔ اتنی کم عمری میں گبرو جوان لگ رہے تھے صاف

ستھرے کپڑے، بالوں میں تیل، چکنا چہرہ، بس ایک ہی کمی تھی۔ وہ زندہ نہیں تھے۔ ایسے ہی تھے جیسے تالاب سے نکلنے کے بعد پھڑ پھڑا کر ساکت ہو جانے والی مچھلی یا پھندے میں آیا ہوا بگلا جس کے بدبودار گوشت سے ہنڈیا بھرنے کے لئے مچھندر اس کی گردن مروڑ دیا کرتے تھے۔

مچھندر کی گردن کسی نے نہیں مروڑی تھی۔ بس ان کے گورے مالک نے انہیں بوٹوں کی زد پر رکھ لیا تھا۔ مچھندر کی تلی پھٹ گئی تھی۔ آنتوں میں چھید بن گئے تھے۔ باہر سے کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا لیکن اندر اندر اتنا خون بہا تھا کہ ان کا پیٹ پھول گیا تھا۔ رات بھر وہ درد سے لوٹتے رہے۔ صبح خون کی ایک کلی کی اور پھڑ پھڑا کر ساکت ہو گئے۔

مچھندر کا قصور تھا کہ رات میں پنکھا کھینچتے کھینچتے دو مرتبہ ان کی آنکھ لگ گئی تھی۔ پنکھا ان کے مالک کے بیڈ روم میں تھا۔ اس کی ڈور روشندان سے ہوتے ہوئے چھوٹے ملحق کمرے میں آتی تھی۔ مچھندر وہاں بیٹھ کر پیر میں ڈوری باندھے لگاتار پنکھا کھینچتے رہتے تھے۔ گرمی کی دوپہروں میں تو دن میں بھی آنکھ جھپک جائے نہ کہ رات کو۔ مچھندر کی ڈیوٹی رات کی تھی۔

''بوا کو کیا ہوا؟''

مچھندر کی ماں نے احمقوں کی طرح موہنہ کھول کر سادہ لوحی سے سوال کیا اور کوئی اس سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ اس دوران مرتجے سری واستو نے کلکتہ جا کر قانون کی تعلیم حاصل کی تھی اور غریب کسانوں اور ان ہندوستانیوں کے مقدمے مفت لڑتے رہتے تھے جن کے ساتھ اس طرح کی وارداتیں گذری ہوں۔ مچھندر کے جس ہندوستانی مالک نے انہیں گورے صاحب کے یہاں بھجوایا تھا وہ از حد شرمندہ تھا۔ اس نے مرتجے شری واستو کو خبر کی۔ انگریز اب بھی عدلیہ اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں پر قابض تھے۔ جج انگریز تھا، مدعا علیہ بھی انگریز۔ مدعی ہندوستانی تھا وہ بھی سماج کے ادنیٰ ترین طبقے کا ہندوستانی۔ مرتجے نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ جرم ثابت ہو گیا اس لئے جج نے اپنی انصاف پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے سزا سنائی۔ دو پونڈ سے کچھ کم جرمانہ۔ انگریز تاجر نے خوشی خوشی جرمانہ ادا کر دیا اور اپنی

زہر آلود ہری نیلی آنکھوں سے مرتجسے کی طرف ایک زہریلی مسکراہٹ پھینک کر عدالت سے باہر نکل گیا۔

(اس کے کچھ عرصے بعد چرچل نے بنگال کے قحط سے حاصل ہونے والے بھیانک اعداد و شمار سننے کے بعد کہا تھا: ہندوستانی خرگوشوں کی طرح اپنی نسل بڑھاتے ہیں۔ جلد پھر اتنے ہی ہو جائیں گے)

مچھندر کی ماں نے پینتیس سال عمر پائی (دادی نے پینتالیس پائی تھی) مچھندر کے بعد کے تین بچوں میں سے ایک سوکھے کا شکار ہو کر ان کے سامنے ہی ختم ہو گیا تھا۔ ماں، دادی، دادا، باپ، بڑے بھائی، سب کا سایہ اٹھ جانے کے بعد وہ بچے کہاں رلے، کتنے دن جئے، یہ کسی تاریخ میں رقم نہیں۔

مچھندر کی روح عالم برزخ میں اتنے دن چکراتی پھری تھی کہ اس درمیان نہ جانے کیا کیا ہو گیا تھا۔ گاندھی بابا نے اہنسا کا سبق دیا تھا لیکن لوگ نہ جانے کتنی بار ہنسا پر اترے۔ جتنی بار انھوں نے تشدد برتا گاندھی بابا نے برت رکھ رکھ کے اسے اپنے اوپر جھیلا۔ لیکن اپنی ساری نیک نیتی، اپنی کرشمائی شخصیت کے باوجود وہ ملک کی تقسیم نہ رکوا پائے۔ ان کا کوئی اصول کام نہ آیا۔ ملک آزاد ضرور ہوا لیکن دھرتی تڑتڑ تڑخی۔ خاک و خون میں لتھڑ کر انسانوں نے پہلے ملک کے دو ٹکڑے کیے پھر تین۔ اپنے اپنے ملکوں میں اپنے اپنے سربراہوں کو مارا۔ سب سے پہلے تو گاندھی بابا ہی شہید کیے گئے تھے۔ گرچہ انہیں بے پناہ محبت ملی اور بے پناہ عقیدت بھی۔ اتنی کہ مارنے کے بعد انہیں ہار پھول پہنا کر سارے دفتروں، سارے اسکولوں اور ایوانوں میں ٹانگ دیا گیا۔ اب وہ وہیں لٹکے پوپلے منہہ سے مسکراتے رہتے ہیں۔ سیاسی لپاڈگی کرنے والے آپس میں دست و گریباں بدعنوان لوگوں کو ہاتھ اٹھا کر پتہ نہیں حرکتوں سے باز آنے کی رائے دیتے ہیں یا اتنے عاجز آ چکے ہیں کہ آشیرواد دینے لگے ہیں کہ جاؤ جہنم میں، جو جی چاہے کرو۔

وہ حرامزادے گورے، لال مونہہ والے بندر چلے گئے نہ۔ مچھندر کی روح نے سوال کیا۔

ہاں، کب کے چلے گئے۔

اب ہمیں بوٹ کی ٹھوکروں پر رکھ کر کوئی ہماری تلی کلیجی نہیں پھاڑے گا، مجھندر نے مسرور لہجے میں کہا اور خوشی خوشی زمین پر اتر آئے کہ ابھی نروان حاصل کرنے کے لئے انہیں کئی جنم لینے تھے۔

مجھندر نے آنکھیں پٹپٹا کر دیکھا۔ ان کے گاؤں میں چاپاکل لگ گئے تھے۔ اب پانی کنویں سے نہیں کھینچنا پڑتا تھا نہ ٹھاکر۔ باہمنوں کا کنواں الگ تھا۔ بھولے بھٹکے کبھی چوری چھپے وہاں سے پانی لے لینے پر مار کھانے کا ڈر نہیں رہ گیا تھا۔ بجلی کے کھمبے بھی گڑ گئے تھے گرچہ بجلی آتی نہیں تھی۔ چلو تار کھنچ گئے ہیں کبھی تو آئے گی۔ چھ سات کوس پر ایک پرائمری ہیلتھ سنٹر تھا۔ (اب میل اور کوس نہیں چلتا تھا کچھ لوگ کلومیٹر بولتے تھے۔ پھر بھی زیادہ تر لوگ کوس میں ہی فاصلہ بتاتے تھے۔ مجھندر کو بھی وہی سہل لگتا تھا) ڈاکٹر صاحب غائب ہی رہتے تھے کسی مریض کی قسمت اچھی ہوئی تو کمپونڈر صاحب مل جاتے تھے۔ زیادہ اچھی ہوئی تو دوا دارو بھی دے دیتے تھے۔ سوئی لگا دیتے تھے۔ لیکن زیادہ اچھی قسمت کم ہی لوگوں کی ہوتی تھی۔ ایک تو سڑک ایسی خراب کہ مریض اگر سیریس ہوا تو ڈنڈا ڈولی کر کے لیجاتے لیجاتے راستے میں ہی مر جائے۔ جیسے پھوکن سہنی کی بہو۔ بچہ آدھا پیٹ سے باہر آ کر جنم لینے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ پاؤں سے پیدا ہوا تھا۔ اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ دنیا کو دیکھ کر پوری طرح باہر آنے سے انکار کر رہا تھا۔ دائی نے بہت کوشش کی تب ڈولی پر ڈال کر سہنی کی سولہ سالہ کامنی سی بہو کو ہیلتھ سنٹر لیجایا گیا۔ پہونچتے پہونچتے ختم۔ مزے کی بات تو یہ کہ بچہ بچ گیا۔ لیکن اتنی دیر تک جنم نال میں پھنسا رہنے کی وجہ سے سر کی ہیئت بگڑ گئی تھی اور دماغ پر ضرب آئی تھی۔ اس لئے لنج ہو گیا تھا۔

گاؤں میں جب گاندھی بابا، کستور با اور ان کی ساتھی عورتیں آئی تھیں تو کچھ عارضی میڈیکل سنٹر قائم کئے گئے تھے وہ مہربان عورتیں بتاتی تھیں کہ کھانا کھانے سے پہلے اور شامید ان کے بعد ہاتھ دھو لینے چاہئیں، چاہے صاف جگہ کی مٹی سے دھو لو چاہے (ملے

تو) صابن سے دھولو۔ اب آنگن باڑی سیویکا آ کے مچھندر کی ماں کو یہی سب بتا رہی تھی۔ لوگوں نے ابھی تک نہیں سیکھا؟ یہ تو بہت پہلے کی بات ہے کہ کستور با آئی تھیں۔ مچھندر حیرت سے سوچنے لگے۔

مچھندر کی ماں ناراض ہو رہی تھی۔

''صابن؟ کہاں سے لائیں صابن؟ چار بچے ہیں، ایک ملک، ایک ہم، ایک مائی۔ بابو جی۔ اتنے لوگ صابن سے ہاتھ دھوئیں گے؟ تو صابن تمہاری سرکار تو دے نہیں رہی ہے تم لوگوں کو بھیج دیتی ہے الٹا سیدھا پاٹھ پڑھانے۔''

با کی بات تو عورتیں سر ہلا ہلا کے سن لیتی تھیں۔ ان سے کوئی ناراض بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ اماں کو کیا ہو گیا ہے۔

''مٹی میں تو پیسہ نہیں لگتا بھوجی۔ مٹی سے دھو لیا کرو۔''

''پانی بھی کون سا آ رہا ہے۔''

''چاپا کل ہے نہ۔''

''سوکھا پڑا ہے''۔ مچھندر کی ماں نے سر کی ٹوکری پٹک کر مزید غصے سے کہا۔ وہ ابھی چولہا جلانے کے لئے سوکھی ٹہنیاں پتے اور جنگل میں پڑے گوبر کے خشک ڈھیلے اٹھا کر لائی تھی۔ ''اگلا چاپا کل ایک کوس دور ہے۔ بالٹی ڈھو ڈھو کے پانی لاتے ہیں۔''

''اسی میں سے نکالو ہاتھ دھونے کے لئے بھی۔'' سیویکا نے اب کی ذرا خشک لہجے میں کہا۔ پھر وہ یکایک سنجیدہ ہو گئی۔

''اچھا ذرا ان لوگوں سے ساودھان رہنا۔ ان کے پھیرے میں تم پڑے تو پھر تم جانو۔ بابو صاحب اور بابا جی لوگ سب ٹوٹ پڑیں گے۔ اور ان سے پہلے پولس والے۔ سیانی بیٹی کی ماں ہو۔''

''کس سے؟''

''انہیں لوگوں سے، کہا تو۔ بہت گھوم رہے ہیں۔'' وہ لگ بھگ پھسپھسا کر بولی۔ پھر زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ جان کے آگے بڑھ گئی۔

مچھندر کو خیال آیا اسے کچھ لوگ گھومتے دکھائی تو دیے تھے جو ذرا عجیب سے لگ رہے تھے۔ بدن چرا کر چلتے اور صافے سے نصف چہرہ یوں ڈھکے رہتے جیسے از خود ڈھیلا ہو کر ان کے موہنہ پر چلا آتا ہو۔ لوگوں کو چوکنا ہو کر، ذرا مشکوک نظر سے دیکھتے ایک بار مچھندر بہت پریشان ہو گئے تھے۔ ایک آدمی گاؤں کے ستو، چوڑا، بیچنے والے کی دوکان پر کھڑا کہہ رہا تھا ''کچھ کچھ سن رہے ہیں ہم۔ کان کھول کے تم بھی سن لو۔ خبری بننے کی کوشش کی ہے تو جان سے مار دیں گے۔''

اب کون سے خبری۔ کیسے خبری۔ مچھندر پھر کنفیوز ہو گئے۔ گاندھی بابا کے وقت میں کچھ بچے ادھر سے ادھر پرچیاں لے جانے کے لئے تعینات کیے گئے تھے۔ انہیں جان کا خطرہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن آزادی کی جنگ کی خاطر انکے ماں باپ انکی جان جوکھم میں ڈالنے سے ہچکچاتے نہیں تھے۔ اب یہ ادھیڑ عمر کا بھولا پاسوان گڑ، چنے، ستو بیچنے والا یہ کس کا پرچہ ادھر سے ادھر سرکائے گا؟ مچھندر نے اس آدمی کو غور سے دیکھا تو جواب میں انہیں تیز نظروں سے گھورتا ہوا وہ آدمی تیزی سے یوں غائب ہوا جیسے وہ کوئی بھوت پریت تھا۔ غبار جیسا ہلکا۔ چڑیا کے پر جیسا سبک۔

مچھندر بھومیہاروں کے کھیتوں پر کھیت مزدور کے طور پر کام کرتے تھے۔ چھوٹا سات آٹھ سالہ بھائی یونہی ڈنڈے بجاتا گھومتا تھا۔ کبھی تالاب سے گھونگھے اور چھوٹی مچھلیاں چھان لاتا، کبھی کسی کے کھیت سے ساگ نوچ لاتا، کبھی کچے پکے موسمی پھل جو پیڑ سے ٹپک پڑتے، اکٹھا کر لاتا تھا۔ اس کا اپنا پیٹ انہیں چیزوں سے بھر جاتا۔ ہاں برسات کے موسم میں کبھی کبھی چار پانچ انچ بڑی مچھلیاں دس پندرہ کی تعداد میں مل جایا کرتی تھیں تو ماں خوش ہو جاتی تھی۔ سرسوں پیس کر خوب سارا نمک مرچ ڈال کر پتلے شوربے میں مچھلیاں ڈال دیتی تو سارا گھر مچھلی بھات کھاتا۔ ایک ایک دو۔ دو چھوٹی مچھلی اور کٹوری بھر نمک، مرچ سرسوں کا شوربہ ہر آدمی کو مل جاتا۔ موہنہ سے لے کر جسم کے آخر تک مرچیں ہی مرچیں۔ ایسی ہی ہانڈی جب بھرتی جب یہ تیز طرار چھوٹکا غلیل سے چڑیاں شکار کر کے لے آتا تھا۔ ایک بار تو دبے پاؤں پانی میں گھس کر چھوٹی مرغابی پکڑ لی تھی۔ اماں اسی لئے

اسے بہت مانتی تھی۔ لیکن ایسا وقت بھی آتا تھا جب کوئی فصل نہیں ہوتی تھی، نہ بونی نہ کاٹنی۔ اس وقت وہ سب گایوں کی سانی پانی کرتے، مویشی چراتے، کُٹی کاٹتے اور نمک بھات کھا کے سو جاتے۔ مچھندر کا باپ بورنگ کا کام کرتا تھا۔ وہ کام بھی کبھی ملتا کبھی نہ ملتا۔

ایک بار ایک پریشانی اور آ گئی تھی۔ دھان کی روپنی کے دوران مچھندر کی ماں کے پیر سوج گئے تھے۔ انگوٹھوں کی کھال جھڑنے لگی تھی۔ کئی بار ہیلتھ سنٹر کے چکر لگائے تو ایک بار کمپونڈر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے کہا دس پندرہ دن پیروں کو خشک نہ رکھا تو انگلیاں گل جائیں گے۔ وہ گھر بیٹھ گئی۔ رسی بٹ لیا کرتی کہ کچھ تو بھرپائی ہو جائے۔

انہیں دنوں ان کے گھر وہ آیا

مچھندر چھوٹے بھائی کو ڈاکوؤں کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ وہ ڈھاٹے باندھ کر آتے۔ اور گھر کا مال اسباب سمیٹ کر چل دیتے۔ جانور کھول لیجاتے تھے۔ پیچھے سے فائر کرتے جاتے کہ کوئی پیچھا نہ کرے اور کئی کئی کے گروہوں میں چلا کرتے تھے لیکن وہ تو اکیلا تھا۔ بیشک اس کا چہرہ جب آیا تھا نصف ڈھکا ہوا تھا اور کپڑوں کے اندر گولیوں کی پیٹی اور ریوالور بھی تھے۔ عمر میں وہ مچھندر سے کچھ بڑا تھا۔ ہوگا بیس ایک برس کا۔

یہاں سے کیا لیجاؤ گے بھیا۔ مچھندر کے بھائی نے دانت نکوس کر کہا۔ مٹی کے ہنڈیا برتن ہیں۔ اماں کی دو پھٹی پرانی دھوتیاں ہیں۔ ایک بکری بندھی ہے، بھلا ہے۔ (جو بچہ نہ دیتی ہو)۔ انہوں نے انگلی پر سب گنا دیا۔

وہ عین رات کے کھانے کے وقت آیا تھا۔ ہنس کر بولا سبیر ے سے کچھ نہیں کھایا۔ پہلے کھانا تو کھلاؤ۔

بابو جی نے چھوٹے کو گھور کر دیکھا۔ مچھندر جلدی سے اپنی تھالی کے بھات میں آلو کا چوکھا ملنے لگے۔ یہ چھوٹا جو مونہہ میں آئے بولنے لگتا تھا۔ لیکن یہ آدمی کون ہے۔ اماں کچھ نہیں بول رہی۔ بابا دادی بھی چپ ہیں۔ اماں تو جلدی سے بابا والی المونیم کی تھالی نکال کر اسے بھات دینے لگی ہے۔

دونوں لڑکیوں اور چھوٹے کو کوٹھری میں گھسا دیا گیا تھا۔ گھر کے بڑے بیٹھے رہ

گئے تھے۔ مچھندر اٹھارہ انیس کے ہو رہے تھے۔ ان کا شمار بڑوں میں کر لیا گیا تھا۔ ٹھنڈ بہت تھی۔ ان سب کے بیچ بڑے سے لوہے کے تسلے میں آگ جل رہی تھی۔

''وہ صبح صبح میدان گئی تھی دو تین دن سے اس کا پیٹ خراب تھا۔'' اس نے بیڑی کا کش کھینچ کر کہا

''یہ تو کتھا بانچ رہا ہے۔'' مچھندر نے سوچا

''پیٹ خراب ہونے کی وجہ سے وہ اور لوگوں سے پہلے ہی اٹھ گئی اور تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ وہیں پوکھر کے کنارے کی جھاڑیوں سے اٹھا لی گئی۔''

کس نے اٹھایا؟ گوروں نے؟ اور کیسے؟ مچھندر کے دماغ میں سوال گولیوں کی طرح چھوٹے لیکن وہ چپ ہی رہے کیوں کہ اور لوگ بھی چپ تھے صرف تسلے میں جلتی ایک ٹہنی زور سے چٹخی جیسے اس نے مچھندر کے سوال پڑھ لئے ہوں۔

بھٹے پر کام کرتی تھی۔ منشی جو اجرت بانٹتا اس میں سے روپے میں دو آنے رکھ لیتا تھا۔ عورتیں الگ کمرے پر بلاتا رہتا تھا۔ اس نے ہمیشہ انکار کیا۔ زبان کی تیز تھی۔ ایک دو بار گالی دے بیٹھی تھی۔ جب اسے چھوڑا گیا تو اس ادھ مری نے بھی بڑا ہلا مچایا۔ کچھ عورتیں اس کے ساتھ ہو گئیں۔ پولس میں رپٹ لکھوانے گئیں تو داروغہ نے ڈانٹ کے بھگا دیا۔ وہاں سے دھمکی دیتی ہوئی آئی کہ بڑے صاحب کے پاس جائے گی۔ روز جا کے دھرنا دے گی۔ جب بھی ملیں۔ کبھی تو ملیں گے۔ بھائی ڈر گیا تھا۔ وہ کہتا تھا جو ہوا سو ہوا اب چپ رہے تو ٹھیک ہے۔

''لچھمی تھی نہ تمہاری بھتیجی'' مچھندر کی ماں نے زبان کھولی۔

نام کی ہی نہیں گن کی بھی لچھمی تھی اور روپ کی بھی۔ دیوی جیسا چہرہ تھا اس کا۔ گول اور صاف رنگ کا۔ ہم لوگوں کی جات میں رنگ صاف کہاں ہوتا ہے۔ بھر دن محنت کرتی تھی۔ اس کی محنت سے گھر میں برکت تھی۔ بھائی تو جو کماتا پی جایا کرتا تھا۔ دونوں بڑے لڑکے ہماچل چلے گئے تھے۔ چائے خانے میں نوکری کرتے تھے۔ اسی لئے لڑکی کے بیاہ میں بھی دیر کر رہا تھا۔

''ہم نے سنا تھا۔'' مچھندر کے باپ نے ہولے سے کہا

''سب نے سنا۔ آپ نے ہی نہیں ماما''

بابوجی اس ڈکیت جیسے لگنے والے کے ماما کیسے ہو گئے؟ مچھندر نے سوچا لیکن چپ رہے۔

ڈکیت جیسے جوش میں بھر گیا تھا ''سب نے سنا۔ آپ ہی نے نہیں۔'' اس نے بات دوہرائی اور مکہ لہرا کر اپنے ہی ہاتھ پر مارا۔ اسے اینٹ بھٹے کی چمنی میں ڈال کر زندہ جلا دیا گیا اور کہیں کچھ نہیں ہوا، ایک پتہ نہیں ہلا۔ ایک آدمی نہیں اٹھا۔ دھمکیوں کے آگے سارے بھٹے کی آواز اس کے ساتھ جل گئی۔ ہم بہت دوڑے۔ بھائی بھی پینا چھوڑ کر ہوش میں آ گیا تھا۔ وہ بھی ساتھ جاتا تھا۔ تھانے والے ہمیں بھگا دیتے تھے۔ بھٹے کے مالک بابا جی لوگ تھے۔ پیسے والے تھے۔ ان کے پریوار کے لوگوں کا اتنا اثر تھے کہ نیتا گیری کرنے والے بھی ان سے دبتے تھے۔ تبھی ہمیں دُوڈ ملے۔ ہمارا گھر دوار تو تھا نہیں۔ ابھی بیاہ بھی نہیں کیا تھا۔ ہم نے کہا بھائی تو گرہست ہے۔ ہم جاتے ہیں۔ وہ گاؤں میں رہ کر ہمارے ہاتھ مضبوط کرے گا۔ تب سے ہماری لڑائی جاری ہے۔ ہم نے ان کا اینٹ بھٹہ ہی نہ پھونک ڈالا تو دھکار ہے ہمیں اور ہم کیا ایک بچھی کا بدلہ لے رہے ہیں؟ رام دھن کی سات سال کی بچی کی لاش گنے کے کھیت میں ایسی ملی تھی جیسے گدھوں نے نوچا ہو۔ کوئی پکڑا گیا؟ رام دھن کو تھانے کے سپاہیوں نے جوتوں سے مارا۔ ماما تم ریگا میں پل بنانے کے کام پر گئے تھے۔ کتنے دن کی مجوری ملی تمہیں؟ تم سمجھتے ہو ہمیں معلوم نہیں ہے۔ کتنے لوگوں کا نام وردھا پنشن میں لکھا ہوا ہے اور کتنے لوگوں کو پنشن مل رہی ہے؟ لال کارڈ ان لوگوں کے نام جاری کیے گئے ہیں جن کی کوٹھیوں میں دھان بھرا ہوا ہے، کوئی دیکھنے آ رہا ہے؟ اور تم کیا کر رہے ہو مچھندر؟ اسکول میں نام لکھائے تھے کوئی پڑھانے آتا تھا؟ ہاڑ توڑ کام کرتے ہو پیر میں جوتا نہیں۔ تن پہ جاڑے میں گرم کپڑا نہیں۔ پیٹ میں پورا کھانا نہیں۔ پورا ہوا تو اچھا نہیں۔''

مچھندر کی ماں نے ناک سڑکی اور آنکھیں پونچھیں۔ اس کی پہلوٹھی کی بیٹی سولہ برس میں بیاہی گئی۔ سترہ میں ماں بننے والی تھی۔ خرچ کے ڈر سے داماد گھر پر چھوڑ گیا تھا۔

ڈاکٹر نے اسے شدید انیمیا بتایا تھا۔ اے این ایم (ANM) آیا کرتی تھی۔ کہتی تھی دال، ہری سبزی، دودھ کھلاؤ۔ یہاں تو آلو بھات چھوڑ کر اور کچھ ملنا مشکل تھا۔ بھر پیٹ چوکھا بھات مل جاتا تھا۔ کبھی کوئی بھوکا نہیں رہا وہی وردان مان کر لوگ خوش تھے۔

''اوپر سے وہ آتے ہیں حرامی کے پلے پروڑھ شکشا والے، وہ گاؤں والوں کو سبق پڑھاتے ہیں کہ گاؤں چھوڑ کر شہر نہ جاؤ۔ گاؤں میں ہی رہو۔ نہ بجلی نہ پانی نہ سواستھ نہ سڑک نہ روزگار۔ اور شہر میں بھی کیڑے مکوڑوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ بس کام مل جاتا ہے۔ گاؤں میں نریگا ہو یا منریگا پیسہ کس کی جیب میں جا رہا ہے یہ کون نہیں جانتا۔''

'تم نے تو دس سال پہلے گاؤں چھوڑا تھا۔' مچھندر کے باپ کی آواز کمزور تھی

ہمیں پل پل کی خبر ہے۔ مکھیا جی نے حال میں بولیرو گاڑی خریدی ہے۔ ٹریکٹر پہلے ہی لے چکے تھے ان کے پاس نہر کے کنارے پانچ بیگھہ اپجاؤ کھیت تھے۔ ان کو گروی رکھ کر کافی پیسہ مل گیا اسے جھونک کر مکھیا کا الیکشن جیتا۔ جس سے مکھیا بنے، کھانے کے بھی لالے تھے۔ کھیت گروی پڑے تھے اور لڑکا لفنگئی کرتا گھومتا تھا۔ اب وہ بھی سرکاری اسکول میں ٹیچر لگ گیا ہے۔ ہر مہینے مفت کی تنخواہ اٹھاتا ہے اور مڈ ڈے میل کے لئے مہینے میں اناج آتا ہے تو آدھا اناج راستے سے اٹھوا لیتا ہے۔''

ہمارے دور کے رشتے داروں میں وہاں ایک ادھیا پک ہیں۔ انہوں نے کہا تھا بابو صاحب کھائیے لیکن ذرا ہاتھ روک کے۔ چوتھائی لے لیجئے بہت ہوگا۔ پوری گاڑی بھر اناج رہتا ہے۔ اس سے چپ رہے لیکن بعد میں جنگل کے کھیت کی منڈیر پر چار لوگوں نے اسے گھیر کر سائیکل کی چین سے پیٹا۔ ہم کو بتا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، ہم سمجھتے نہیں ہیں کس نے پٹوایا اور کیوں۔ تب بھی چپ بیٹھے رہتے ہیں آپ لوگ۔ جنگل کے اندر کتنے لوگ لڑ رہے ہیں۔ سولہ سولہ سال کے لڑکوں نے ہتھیار اٹھا لئے ہیں۔''

''کون لڑ رہا ہے اور کس سے؟ ارے کیا انگریز لوٹ آئے؟ یا انگریز گئے ہی نہیں تھے؟ بڑا ڈنڈ مچا رکھا تھا انہوں نے۔'' مچھندر اچانک بول پڑے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انہوں نے یہ کیوں کہا تھا۔ کون انگریز، کیسے انگریز؟ ان کی زبان پر کون آن بیٹھا تھا۔

''ارے کل جبھے شبھ شبھ بول۔ کون لوٹ آیا؟ کہاں سے لوٹ آیا؟'' مچھندر کی ماں نے جلدی سے ٹوکا اس کے خیال سے اکثر مری ہوئی آتمائیں لوٹ آتی تھیں تو بہت پریشان کرتی تھیں۔ وہ باڑھ لے آتی تھیں یا پھر بارش روک دیتی تھیں تو سوکھ پڑ جاتا تھا۔ کچھ لوگوں کی مت پھیر دیتی تھیں تو وہ ڈاکو بن جاتے تھے یا جنگلوں میں غائب ہو جاتے تھے۔

''کوئی نہیں لوٹا تو یہ اپنے ہی ملک میں اپنے ہی شاسن میں کس سے لڑ رہے ہیں؟'' مچھندر کے اندر موجود مچھندر نے سوچا۔

''اسے ہمارے ساتھ کیوں نہیں بھیج دیتے۔ ہمارا شام کا اسکول چلتا ہے۔ پڑھا بھی دیں گے۔''

اس آدمی نے مچھندر کی طرف اشارہ کیا۔ مچھندر کی ماں نے ایک اضطراری ردِّعمل کے طور پر جلدی سے اسے اپنی طرف کھینچ لیا جیسے وہ آدمی بھٹکی ہوئی آتما ہو اور مچھندر پر اپنا سایہ ڈالنے والا ہو۔

''کچھ نہیں ہوگا مامی۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اور یہاں کون سا اچھا ہونے والا ہے۔'' مچھندر کی ماں کے ردِّعمل پر وہ یکلخت ہنس پڑا تھا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولا تھا۔ ''ہم کسی کے ساتھ زبردستی کرنے نہیں آئے۔ یہ آئے گا ایک دن۔ اپنے آپ ہی آئے گا۔ ابھی بس ایک بات کان کھول کر سن لو اور سب تک پہونچا بھی دو۔ الیکشن ہونے والا ہے ٹولے کا ووٹ ہمارے آدمی کو جائے گا۔''

''ووٹ دینے دیا جائے گا تب تو۔ پچھلی بار ٹولہ گھیر کر ایک آدمی کو بھی نکلنے نہیں دیا گیا تھا اور سب کے ووٹ گر گئے تھے''

''اس بار ہم لوگ ہیں۔ دیکھ لیں گے۔ لاشیں بچھ جائیں گی۔ سب پچھلی بار جیسا نہیں رہ گیا ہے۔''

اس نے سفاک لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے کی سفاکی دیر تک ٹھنڈی ہوا میں برف کی کاٹ کی طرح ٹھہری رہی۔ چھپٹیاں سب جل چکی تھیں۔ سفید چھائی نے چھوٹے

چھوٹے انگاروں کو ڈھک لیا تھا۔ اچانک رات کے سناٹے میں کسی الو کی بھیانک چیخیں گونج اٹھیں۔

رات میں سن سن کرتی برفیلی ہوا کے بیچ وہ آدمی اٹھ کر خاموشی سے یونہی نکل گیا جیسے آیا تھا۔

اپنے کپڑوں کے اندر سے اس نے ایک لپیٹا ہوا کاغذوں کا رول چھپالیا اور ایک ڈبہ بھی جس میں وہ مچھندر کی ماں کے چند ڈبوں، مٹی کی ہانڈیوں اور مٹی کے چولہے پر مشتمل باورچی خانے میں لئی پکا کر لے گیا تھا۔

رات خاصی باقی تھی۔ مچھندر سو گئے لیکن جلد ہی پھر سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

آج ایسا لگ رہا تھا کہ ایک الو بولتا ہے تو دوسرا اسے جواب دے رہا ہے۔

الو اتنے سمجھدار کب سے ہو گئے۔ مچھندر نے سوچا اور کچھ دیر سوچتے سوچتے پھر گٹھری کھینچ کر نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

صبح مچھندر کے گھر میں موت کا سناٹا پسرا پڑا تھا۔ پھر اس سناٹے میں مچھندر کے باپ کی سانپ جیسی پھپھکار گونجی۔ اس نے سب بچوں کو مخاطب کر کے کہا۔ 'خبردار جو موہنہ سے بولی پھوٹی کہ رات ہمارے گھر کوئی آیا تھا'

''وہ بیتال تھا بیتال۔ آدمی بن کے آیا تھا۔'' مچھندر کے دادا نے ناریل گڑگڑاتے ہوئے بیچ میں میں لقمہ دیا۔

مچھندر کے بھائی بہنوں کے چہرے کاغذ کی طرح سفید پڑ گئے۔

''بابو'' مچھندر نے اکیلے میں باپ سے کہا۔'' وہ بیتال نہیں تھا۔ ہماری تمہاری طرح کا آدمی تھا۔ یہاں کیوں آیا تھا؟ تمہیں ماما کیسے کہہ رہا تھا اور یہ کیوں کہہ رہا تھا کہ ہمیں اس کے ساتھ بھیج دیا جائے۔ اور یہ لڑ کس سے رہا ہے؟''

''بہت بکتا ہے بچوا۔'' مچھندر کا باپ ناراض ہو گیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا'' اس سے دور کی رشتے داری ہوتی ہے۔ اس کی بھابھی ہمارے گاؤں کی بیٹی ہوتی ہے۔ اس طرح اس کی بھتیجی جو اینٹ بھٹے میں ڈال کر جلا کر ماردی گئی ہمارے گاؤں کی ناتی ہوئی۔

ناطہ جو بھی ہو ہم اسے آنے سے نہیں روک سکتے تھے۔ کل سے دو آدمی پکیت کے گھر گھسے بیٹھے ہیں۔ منع کریں تو یہ ہمارے دشمن بن جائیں گے۔ یہ کس سے لڑ رہے ہیں اور وہ تمہیں کیوں لیجانا چاہتا تھا ہم نہیں بتا سکتے۔ چپ رہنے میں بھلائی ہے۔"

"ہم اس کے ساتھ جائیں کیا؟" مچھندر کو اپنے بازو پھڑکتے ہوئے محسوس ہوئے (جب چمپارن میں مجمع نے گاندھی بابا کی جے کے نعرے لگائے تھے تب بھی مچھندر کے بازو ویسے ہی پھڑکے تھے گرچہ تب مچھندر اٹھارہ برس سے بہت کم عمر کے تھے۔ مچھندر کی عمر ادھر خاصی بڑھی تھی)

"پاگل ہوا ہے کیا؟" بابو بڑی زور سے بگڑ گیا۔

دوسرے دن سہ پہر ہوتے گاؤں میں چار آدمی مارے گئے اور درختوں کے تنوں پر، چوپال کی دیوار پر پوسٹر چپکے ہوئے دکھائی دئے۔ "ودھان سبھا سور کا باڑا ہے۔ گنڈوں کا اکھاڑا ہے۔" مارے جانے والوں میں مقامی ایم ایل اے کا بھائی بھی تھا جو اپنے بھائی کے دھوکے میں مارا گیا تھا۔ ویسے غنڈہ گردی میں مشہور وہ بھی تھا۔ ڈرے سہمے لوگ آپس میں کہہ رہے تھے کہ پوسٹر کب چپکے، کس نے چپکائے۔ بھوت آتے ہیں کیا۔ تبھی معلوم ہوا کہ کوئی بھوت بھوانے میں ایک خط پھینک کر گیا تھا جس میں ایک لاکھ روپیوں کا مطالبہ تھا۔ جگہ کی نشاندہی تھی۔ وہاں جو آدمی ہوگا اس کے ہاتھ میں پکے کیلوں کا گچھا اور ماتھے پر تلک ہوگا۔ جو روپیہ لے کر جائے وہ کندھے پر لال گمچھا ڈال کر جائے اور اکیلا جائے اگر پولس کو خبر کی تو گاؤں میں آگ لگ جائے گی۔

بابو صاحب لوگوں نے دھمکی کی پروانہ کرتے ہوئے خط لیجا کر تھانے میں دیدیا پولس خار کھائے بیٹھی تھی پچھلے دنوں بارودی سرنگوں کے دھماکے میں کئی جوان مارے گئے تھے۔ پورا بھوانہ اور اس سے متصل دلت گاؤں گھیر لیا گیا۔

"تم خبر رکھتے ہو حرامزادو تو ہم بھی رکھتے ہیں۔ بولو کس کے گھر کون آیا تھا۔ سب سالے انہیں چھپا چھپا کے کھانا کھلاتے ہیں۔ ہتھیار خرید کے لاکے دیتے ہیں۔ پولیس کئی نوجوانوں کو پکڑ کے پیٹتی ہوئی لے جانے لگی تو مچھندر سے نہیں رہا گیا۔" ہمارے گھر آیا تھا

وہ۔'' انہوں نے سینہ ٹھوک کے کہا۔ ''باپو کو ماما کہہ رہا تھا ان بے چاروں کو کیوں مار رہے ہو۔ چھوڑ و انہیں چھوڑ و۔ چٹھی وہی چھوڑ گیا ہوگا۔ اس نے رات کو ہمارے گھر لیئی بھی بنائی تھی۔'' مچھندر جیسے فخر سے بولے جا رہے تھے۔ ہاں کچھ ہوتے ہیں جن میں لڑنے کی قوت ہوتی ہے جن میں ہمت ہوتی ہے اور جو انصاف چاہتے ہیں۔ گاندھی بابا کیوں اٹھے تھے؟ جب وہ اٹھے تھے تب ہی تو دوسرے پیچھے آئے تھے۔''

پولیس نے جنہیں پکڑا تھا انہیں تو چھوڑا انہیں مچھندر کو بھی دو چار ڈنڈے مار کر ساتھ گھسیٹ لے گئے اور اس کے باپ کو بھی۔ مچھندر نہایت خوشی خوشی ساتھ ہو لئے۔ دو چار ڈنڈوں کی ان کے جوان جسم نے پروا نہیں کی۔ لیکن تھانے میں ان کی خوشی کافور ہو گئی جب مزید 'انفارمیشن' لینے کے لئے انہیں داروغہ جی نے کیلوں بھرے جوتوں کی نوک پر رکھ لیا۔

''گورے ہیں۔ گورے ہیں۔ گورے پھر آ گئے ہیں۔ خالی انہوں نے اپنا مونہہ ہٹی مل کے کالا کر لیا ہے۔'' مچھندر چلائے۔

''کیا بک رہا ہے؟ کس کا مونہہ کالا کر رہا ہے۔'' ڈیڑھ کلو کا جوتا ان کے مونہہ پر پھر پڑا۔

''تم نے ... تم نے اپنا مونہہ کالا کر لیا ہے۔'' وہ ہانپ ہانپ کر چیخنے لگے۔ ''لیکن اس بار ہم تمہیں ماریں گے۔ پچھلی بار ہم چھوٹے تھے اور بے وقوف بھی اس لئے مار کھا گئے۔ اب ہم سمجھدار ہیں اور بڑے بھی ہو گئے ہیں۔ ان کے اٹھارہ برس کے کڑیل، سخت محنت کرنے والے جوان جسم کی مچھلیاں پھڑکیں۔ وہ تڑپ کر گرفت سے نکل گئے اور مارنے والے پر پل پڑے۔ ہم نے اس گورے کو نہیں مارا تھا۔ مار نہیں سکتے تھے۔ تمہیں تو ... یہ لو ... یہ لو ... لیکن مچھندر کی تلی پھر ان کی زد میں آ گئی۔ وہ کئی تھے۔ گورا تو اکیلا تھا۔ جلد ہی ان کے پھیپھڑے خون اگلنے لگے۔ مرنے سے پہلے تین دن خون اگلا۔

پولیس کسٹڈی میں مرنے والوں کے اعداد و شمار میں ایک کا اضافہ ہو گیا تھا۔ مر تجّے سری واستو عالم برزخ میں ہی چکراتے پھر رہے تھے اس لئے اس بار مچھندر کا مقدمہ بھی کسی نے نہیں لڑا۔ کسی جج نے کسی کو کوئی سزا نہیں سنائی۔ کچھ بے وقوف اخباروں والوں

نے شور مچایا کہ ہر نقار خانے میں کچھ طوطیاں ضرور ہوتی ہیں۔ کچھ سر پھروں نے لاش کے ساتھ سڑک جام بھی کیا پھر سب پر مٹی پڑ گئی۔

''ایسا کیسے ہو جاتا ہے؟'' مچھندر نے پوچھا؟

''ہو جاتا ہے، بلکہ ہو چکا ہے تمہارے بابو جی نے بھی کھٹیا دھر لی ہے کیا پتہ وہ بھی مر جائیں۔ تو؟''

''ہم پھر آئیں گے'' انہوں نے دانت پیسے۔

''آؤ۔ آتے رہو . سننے والے نے ہنس کر کہا۔ 'وہ' بھی تو آتے رہتے ہیں جب جب دھرم کی ہانی ہوتی ہے۔''

''مگر ہم آئیں گے۔''

سننے والا کان جھاڑ کے آگے بڑھ گیا۔

# انگوٹھی

اس غریب برہمن کسان کے گھر پکھراج کی وہ قیمتی انگوٹھی کہاں سے آئی یہ بھی دراصل ایک داستان ہی تھی۔ وہ غریب کسان دراصل اتنا غریب بھی نہ ہوتا اگر وہ چمپارن میں نہ ہوتا اور نیل کی کاشت کرانے والے نیلے صاحبوں نے اسے محتاجی کی کگار پر نہ لا کھڑا کیا ہوتا۔ زمین تو اس کے پاس اچھی خاصی تھیں لیکن نیل کی جبری کاشت اور اس کاشت کی وجہ سے باقی زمینوں کی زرخیزی کم ہو جانے کی وجہ سے وہ تقریباً تباہ ہو گیا تھا۔

کسان کے پردادا یا شاید لگڑ دادا گاؤں کے پروہت تھے۔ جمانی سے کچھ زمینیں مل گئی تھیں اور وہ کھیتی کرنے لگے تھے۔ برہمنوں نے تو چھتری دھرم تک نبھایا ہے پھر کھیتی کسانی تو ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی تھی۔ رشیوں مینوں تک کے پاس کھیت ہوا کرتے تھے۔ ایک زمیندار نے بڑی خوبصورت، تنومند گائے دان کی تھی۔ وہ بھی بندھی ہوئی تھی اور بیانے کے بعد اچھا دودھ دے رہی تھی۔ تبھی ان کے دروازے پر وہ زخمی مغل سردار اپنی ہی طرح کے بھوکے پیاسے، زخمی گھوڑے پر سوار آن کر گر پڑا تھا۔ بزرگ برہمن نے اسے اٹھایا۔ گھوڑے کو گائے کے بتھان کے پیچھے آم اور کیلے کے جھنڈ میں چھپا دیا۔ دھان کے کوٹھار میں ان دنوں بھوسہ بھرا ہوا تھا۔ وہاں کتھری بچھا کر مغل بچے کو رکھا اور گاؤں کے وید کو بلایا۔ بزرگ پنڈتائن نے معترض لہجے میں کہا "ترک ہے۔"

"انسان ہے" پنڈت جی نے مختصر سا جواب دیا اور مٹی کے کلہڑ میں گیا کا دودھ لے کر کلہڑ اس کے مونہہ سے لگایا۔ وید جی بھی برہمن تھے اور زیادہ تر وید اچاریہ برہمن ہی ہوا

کرتے تھے۔ دونوں نے آپس میں صلاح کی کہ اس کی خبر کسی کو نہیں لگنی چاہئے ورنہ اس مغل سپاہی کے ساتھ وہ سب بھی مع زن و بچہ مارے جائیں گے۔ اٹھارہ سو ستاون کے زلزلے کی لہریں پوری طرح بیٹھی نہیں تھیں۔ اب بھی لوگ مارے جا رہے تھے، جائدادیں قرق ہو رہی تھیں۔

بھوسے دانے کے باوجود گھوڑا تیسرے دن مر گیا۔

سردار نے کہا "بابا کوئی بات نہیں۔ اب ہم کون سا گھوڑے پر بیٹھ کر کہیں تیر تفنگ چلانے جا رہے ہیں۔ ہمارے بادشاہ جلا وطن کر دیے گئے۔ شہزادوں کے سر کاٹ کر طشت پر پیش کئے گئے۔ ہمارے جورو بچوں کی کون ہے۔ اب ہمارا گھوڑا تک مر گیا۔ ہم بھی مر جائیں گے۔ آپ کے یہاں کا پاکیزہ آب و دانہ قسمت میں لکھا تھا، جتنے دن کھا لیں۔"

آٹھویں دن وید جی نے کہا، انہیں کچھ اچھا کھانا کھلا دو۔ برہمن میتھل تھا۔ قرض دام کر کے اس نے مچھلی پکوائی اور پوریاں اور باریک سفید باسمتی کا بھات۔ گھر کا نہایت عمدہ خشک دہی کہ انگوچھے میں باندھ کے لے چلو تو پانی نہ ٹپکے، اور گھی اور گڑ۔ کیلے کے پتّل پر یہ سارا کھانا پروسا گیا۔

کھانا کھا کے سردار پوری طرح اٹھ کے بیٹھ گیا۔

"ہمارے پاس کچھ نہیں بچا۔ زن و بچہ مارا گیا۔ گھر گوروں نے لُوٹ لیا۔ بس یہ انگوٹھی ہے۔" اس نے داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت سے سونے کی موٹی سی انگوٹھی اتاری جس میں بڑا سا پکھراج جگمگا رہا تھا۔ دونوں کونوں پر دو ننھے ہیرے اور تھے۔ "یہ ہماری زوجہ کی سخت محنت اور محبت دونوں کی نشانی ہے۔ وہ جانہار زری کا کام نہایت عمدہ بناتی تھی۔ دن کو گھر کے سارے کام نمٹاتی، چھوٹوں کو پالتی، بڑوں کی خدمت کرتی اور رات کو چراغ کی روشنی میں مخمل کے ٹکڑوں پر پھول پتے، چاند تارے یوں بناتی کہ دیکھنے والے کی سمجھ میں فوری طور پر یہ نہ آتا کہ یہ کشیدہ کئے گئے ہیں یا چھاپے گئے ہیں۔ بدخشاں سے آئے جواہرات کے ایک سوداگر نے تین سو کشیدہ کئے ہوئے مخملی ٹکڑوں کے بدلے یہ انگوٹھی دی تھی جو اس عفیفہ نے اس لئے قبول کی کہ سوداگر نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ پتھر ہماری حفاظت کرے

گا۔ وہ اس نے ہماری انگلی میں پہنائی اب اسے آپ رکھ لیجئے۔"

بزرگ پنڈت نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "ہم نے کسی بدلے کی نیت سے سیوا نہیں کی۔ ہم کچھ نہیں لیں گے۔" وہ ہنسا۔ "تب کس کو دیں گے آپ؟ ہمارا اور کون وارث ہے؟ گھوڑے کی زین اور لگام کی اچھی قیمت مل جائے گی۔ وہ بیچ کر ویدجی کا پیسہ چکا دیجئے گا۔"

"رام رام رام۔ ویدجی گاؤں میں کسی سے بھی پیسہ نہیں لیتے۔"

"نہ لیں۔ بیٹی کا ذکر کر رہے تھے۔ اس کے بیاہ کے وقت دے دیجئے گا۔ ہمارے طرف سے تحفہ ہوگا۔"

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟"

"جلدی پتہ لگ جائے گا کیوں کر رہے ہیں۔" اس نے انگوٹھی زبردستی مٹھی میں پکڑا دی۔ بس یوں سمجھ لیجئے ہم آپ کے پاس رکھ رہے ہیں۔ جی بچ گئے تو واپس کر دیجئے گا۔ اس سے گھوڑا خرید لیں گے اور چل دیں گے۔ مر گئے تو آپ کی۔" بزرگ برہمن نے آبدیدہ ہو کر انگوٹھی رکھ لی۔

دوسرے دن علی الصبح سردار نے اپنے چاروں طرف پھلوں کے باغات دیکھے۔ سردے اور سرخ انار اور انگور اور خوبانیاں اور سونے کے طشت اور چاندی کے ظروف میں بہترین شراب جسے شفتالو کے درختوں کے نیچے بادام جیسی آنکھوں والی حسینائیں رقص کرتے ہوئے پیش کر رہی تھیں اور ان سب کے درمیان کیلے کے پتل پر سوکھا دہی اور گڑ اور گھی پروسا ہوا تھا (دہی جسے انگوچھے میں باندھ کر لے جایا جائے تو ایک بوند پانی نہ ٹپکے) اور ساتھ میں بھنی ہوئی مچھلی اور پھولی ہوئی سنہریاں پوریاں۔

دہی مچھلی کی صدائیں سنتے، دل میں کلمہ طیبہ دوہراتے اس مغل سپاہی نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ بزرگ برہمن نے گاؤں کی مسجد کے پیش امام کو بلایا جو اس سے بھی زیادہ بوڑھے تھے۔ ان کی بھویں اور پلکیں تک سفید ہو گئی تھیں۔ وہ زیادہ تر روزے سے رہا کرتے تھے۔ بھوسہ گھر سے رات کے کسی پہر بھوسہ ہٹا کر وہاں قبر کھودی گئی۔ امام صاحب نے نماز پڑھائی اور سپاہی کو شہید قرار دے کر انہیں کپڑوں میں بغیر غسل دیے دفن کر دیا گیا۔

ترک کی کبر ہمارے بتھان میں؟ پنڈتائن نے کہا۔

''سونتنترتا سینانی کی وشرام استھلی ہے، ترک کی کبر نہیں۔'' گھر کے بزرگ نے سختی سے کہا اور وہاں روز رات کو چالیس دن دیا جلوایا۔ پنڈتائن شوہر سے انحراف کرنا نہیں جانتی تھیں۔ خود دیا جلا کر آیا کرتی تھیں۔ (ایک لمبے عرصے کے بعد کستور بائی نے بھی شوہر کے حکم پر سر جھکا کر ہریجن مہمانوں کو گھر میں جگہ دی۔ گھر کے سنڈاس خود صاف کیے)۔

بزرگ پنڈت نے انگوٹھی دھان کی بھوسی کے بیچ ڈال کر اسے ایک چھوٹی سی ٹین کی بکسیا میں رکھا اور کچے گھر کے ایک کونے میں گاڑ کر بڑے بیٹے سے کہا، یہ مغل سینانی کی امانت ہے۔ اگلے بیس برس میں شاید اس کی آل اولاد میں کوئی آ نکلے۔ کوئی نہیں جانتا ودھاتا کیا رچتا رہتا ہے۔ سو کوئی آ جائے تو اطمینان کر کے اسے دیدینا۔ بیس برس تک کوئی نہ آیا تبھی تم کو اس پر ادھیکار ملے گا۔ لیکن یاد رکھنا اسے مصیبت کے وقت ہی استعمال کرنا۔ جیسے ہم اس ویر کے کام آئے وہ ہمارے کام آئے گا۔ عام دنوں میں ویسے بھی اتنی قیمتی انگوٹھی ہم غریب برہمنوں کی انگلی میں شوبھا نہیں دے گی۔ دس سوال اٹھیں گے۔ بزرگ برہمن نے لمبی عمر پائی۔ پھر لوگوں اور گایوں کی خدمت کرتے ہوئے سورگ سدھارے۔ ملک ان کے سامنے غلام ہی تھا۔ اٹھارہ سو ستاون کے بعد انگریز زیادہ مضبوط اور زیادہ سفاک ہو گئے تھے۔ غریب برہمن کسان کا کنبہ اور زیادہ غریب ہو گیا تھا۔ گائے مر گئی تو دوسری گائے بھی نہ خرید سکا۔ کھیتی کے لیے بیل چاہئیں تھے کنبے کے نئے سربراہ نے مہاجن سے قرض لیا کہ کم از کم ایک بیل خرید سکے اور بیٹی کی شادی بھی کرے مہاجن نے کہا کہ وہ اتنا پیسہ بغیر کوئی چیز گروی رکھے نہیں دے سکتا۔ تب بزرگ برہمن کے پر پوتے نے جو پڑوس کے گاؤں میں بیٹی کا رشتہ ٹھیک کر آیا تھا، مٹی کھود کر وہ انگوٹھی نکالی اور دل ہی دل میں ترک سپاہی کو پرنام کر کے اسے مہاجن کے پاس گروی رکھ دیا۔

انگوٹھی کا نگینہ دیکھ کر ساہوکار کے موتہہ میں پانی بھر آیا۔ اسے لوٹانا نہیں ہے، سوچ کر اس نے اسے شہر لے جا کر جوہری کو دکھایا تو یہ ارادہ اور پختہ ہو گیا۔ سُود کا جال کچھ اس طرح جکڑا گیا کہ غریب برہمن کی اگلی چار پانچ نسلیں بھی اس سے آزاد نہ ہو سکیں۔ انگوٹھی

مہاجن کے پرپوتے کی انگلی میں لو دینے لگی۔ کچھ اور وقت گذرنے کے بعد ہل بیل زمین سب مہاجن کے خاندان کے قبضے میں آ گئے۔ برہمن کسان کھیت مجوری کرنے لگا۔

پھر ملک آزاد ہوا اور دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

مہاجن خاندان میں انگوٹھی سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی۔ اصول کے مطابق وہ بڑے بیٹے کو ملتی تھی۔ اب کے بڑے بیٹے نے بیٹی کی شادی طے کرنے کے لئے سمدھیانے میں قدم رکھے تو سمدھی کی نظر انگوٹھی پر ٹکی رہ گئی۔ ایسی انگوٹھی راجے مہاراجوں کے پاس ہوتی ہے۔ شاطر آنکھوں نے سوچا۔ سکھایا پڑھایا لڑکا شادی کے بعد سسرال کے آنگن میں کلیوا پر بیٹھا تو اس نے انگوٹھی کی ضد پکڑ لی۔ ایک انگوٹھی ہی تو ہے۔ کون سا محل دو محلہ مانگ رہے ہیں سسر نے انگوٹھی اتار کر دے دی۔ پڑھا لکھا داماد تھا گریجویشن کر رہا تھا اور آگے وکالت پڑھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لڑکی جاہل تھی اور شکل صورت کی بھی دب تھی۔ بھاری رقم اور لوگوں کی ہڑپی ہوئی زمینوں میں سے ایک بڑے پلاٹ پر معاملہ طے ہوا تھا۔ اب کلیوا پر بیٹھے لڑکے کی فرمائش کو کیسے ٹھکرایا جاتا۔ ساہوکار خوب سمجھتا تھا کہ سماج میں سودی کاروبار کرنے والوں کی اتنی عزت نہیں ہے جتنا پیسہ ہے۔ شان شوکت کے لئے ایک آدھ وکیل، افسر، ڈاکٹر کا کنبے میں آنا ضروری ہے۔

انگوٹھی وکیل بننے والے داماد کی انگلی میں جگمگانے لگی۔

وکیل صاحب چمپارن میں کوئی لاء کالج نہ ہونے کے سبب پٹنہ سے وکالت پڑھ کے آنے کے بعد کچھ دن گاؤں والوں کے مقدمے لڑتے رہے پھر پٹنہ مستقل طور پر منتقل ہو گئے۔ ہاں زمینیں ادھر سستی ہونے کے سبب بتیا کے آبائی گاؤں میں خریدیں یا پھر تیاہی میں کہ وہاں ننہال تھا۔ نہایت گھاگھ وکیل ثابت ہوئے تھے اور گھاگھ تھے اس لئے کامیاب بھی ہوئے۔ لوگوں کو ٹھگنے میں اپنے مہاجن سسر سے کم نہیں تھے۔ ایک بڑے راجپوت گھرانے کے ولی عہد بہادر نے ایک دلت لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کیا۔ دلتوں کو گاندھی بابا خاصہ سر چڑھا گئے تھے اس لئے انہوں نے ایف آئی آر درج کرا دی اور مقابلے پر اتر آئے۔ بڑے ٹھاکر صاحب کے کچھ سیاسی ارادے بھی تھے اس لئے اور زیادہ خم ٹھوک کر

میدان میں اترے۔ مقدمہ انہیں وکیل صاحب نے لڑا اور ریپ کو اس صفائی کے ساتھ اپوزیشن کے سر منڈھ کر لڑکے کو ایسا بے داغ چھڑایا کہ دھوم مچ گئی۔ خود جج سمجھ رہا تھا کہ لڑکا قصوروار ہے لیکن شہادتوں کی فراہمی اور عدم فراہمی دونوں نے مجبور کر دیا کہ لڑکے کو باعزت بری کر دیا جائے۔ وکیل صاحب کے بینک بیلنس میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور شہرت میں بھی پھر وہ لڑکی کہاں گئی، زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا کچھ پتہ نہ چلا۔

وکیل صاحب ایک عرصہ دراز کے بعد اپنی نانیہال پتاہی آئے۔ کسی ماموں کی پوتی کی شادی تھی۔ اب وہ خود تقریباً ادھیڑ عمر تھے اور ایک بیٹا۔ بیٹی بیاہ چکے تھے۔

پرانی یادیں تازہ کرتے، گاؤں میں گھومتے پھرتے ان کی ملاقات ایک پھٹے حال شخص سے ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔

''ارے بنواری ہو کیا؟'' وکیل صاحب نے خوش دلی سے سوال کیا

''وکیل بابو؟'' جواب میں بھی سوال کیا گیا

دونوں لپک کر آگے بڑھے لیکن اپنے اپنے حلیے بشرے کا احساس کر کے بغلگیر ہونے سے ذرا پہلے رُک گئے۔ بچپن میں جب وکیل صاحب نانیہال آتے تو بنواری کے ساتھ فٹ بال، گلی ڈنڈا، کبڈی سارے وہ کھیل کھیلتے جو کم عمر لڑکے کھیلا کرتے ہیں۔

''کیسے ہو بنواری؟'' انہوں نے خلوص سے پوچھا۔

''ٹھیک ہیں بابو۔ دیا ہے بابو لوگوں کی۔''

''بال بچے کتنے ہیں، کہاں ہیں، اور یہ تم ہمارے سنگی ساتھی ہم سے اتنے زیادہ بوڑھے کیسے دِکھ رہے ہو؟''

''آپ؟ آپ ابھی کہاں بوڑھے ہوئے اور وکیل بابو ہم تنک جلدی میں ہیں۔ وہیں آ جائیے نا ہوٹلوا پہ۔ اُو سرکاری اسکولوا کے پاس۔ برگدوا ہے نا۔ وہی کے نیچے۔''

''ارے تم نے ہوٹل کھول لیا ہے بنواری؟'' بنواری لپک جھپک آگے بڑھ چکے تھے۔ پیچھے پلٹ کر مسکرائے۔

پاس سے گذرتے رادھا سوامی اوجھا سے وکیل صاحب نے سوال کیا۔ ''ارے

یہ بنواری اس نے ہوٹل کب کھولا۔ چائے خانہ ہوگا۔" او جھاجی زور سے ہنسے۔ "جائیے، جائیے نا۔ پکوان کھاکے آیئے گا۔"

یہ بنواری بھی گاؤں کا ایک نہایت اہم فیچر تھے۔ ان کے بغیر پتا ہی پتا ہی نہ رہتا۔ کوئی پوچھتا کہ وہ کیا کرتے ہیں تو بڑے فخر سے بتاتے کہ ہوٹل چلاتے ہیں۔ لپک جھپک کہیں چپے جا رہے ہوں اور کوئی بات کرنے کو روکتا تو کہتے، وہیں آجاؤ بھیا، وہیں ہوٹلوا پہ۔ بیٹھ کے آرام سے بتیانا۔ اور واقعی وہ آجاتا تو اپنے نیچے کے چار گمٹوں میں سے دو کھینچ کر اسے دے دیتے۔ ہوٹل کا کُل اثاثہ ایک انگیٹھی، بنواری کی صورت سے میچ کرتی سیاہ رنگ کی بڑی سی کڑھائی، اس میں ویسی ہی رنگت کے ابلتے ہوئے تیل، المونیم کی پرات میں خوب پیاز اور ہری مرچیں ڈال کر سانے ہوئے بیسن اور ایک بڑے سے ٹیڑھے میڑھے المونیم کے کٹورے میں تیتے کی طرح ڈنک مارنے والی ہرے دھنیے کی کھٹی چٹنی پر مشتمل تھا۔ وہ سڑک کے کنارے پلیا کے پاس یہ سارا سامان رکھ لیتے اور بندر کی طرح اچک کر گمٹوں پر بیٹھ جاتے۔ ایک طرف تھوڑی سی دوری پر سرکاری اسکول تھا اور مخالف سمت لگ بھگ اتنے ہی فاصلہ پر تاڑی خانہ۔ گیارہ بارہ بجے تک وہ پکوڑے چھان چھان کے اسکولی لونڈوں کے ہاتھ بیچتے، دوپہر میں گھر چلے جاتے اور چار بجے لوٹ کر پھر ہوٹل کھول لیتے۔ شام گہراتی تو ان کے گاہک تاڑی خانے جانے والے لوگ ہوتے۔ پکوڑے کے دونے اور تاڑی کے چکڑ لے کر وہ اسکول کے برآمدوں میں بیٹھ جاتے اور جُوا کھیلتے۔ کبھی کبھار کوئی زیادہ پی کر وہیں لم لیٹ ہوجاتا۔ گالی گلوج اور مارپیٹ بھی ہوتی رہتی۔ جس دن زیادہ شور مچتا تو کوئی کانسٹیبل ٹہلتا ہوا آنکلتا۔ کبھی کبھار درونہ جی آجاتے۔ جس کی جیب سے جو نکلتا وہ جھڑوا لیتے اور دو چار ڈنڈے مار کر سب کو وہاں سے بھگا کر خود بھی غائب ہوجاتے۔ بنواری چھ عدد بچوں کے باپ تھے۔ لشتم پشتم زندگی چل رہی تھی۔ اہلیہ محترمہ کبھی کبھی 'بڑے گھروں' میں جا کر اناج پھٹک آتیں۔ موسم میں اچار کے مسالے کوٹ دیتیں۔ بدلے میں کبھی چھاچھ مل جاتی، کبھی دُودھ، کبھی تازہ گڑ اور چوڑا۔ یہ گویا بونس ہوجاتا۔ سارے اسکولی بچوں سے بنواری کو خدا واسطے کی محبت تھی۔ وہ ان کے گاہک تھے۔ نہ جانے کیسے کیسے پیسے بچاتے، ماں

باپ کو تنگ کرتے یا دادی نانی کو لیکن ان کے پکوڑے ضرور کھاتے۔ ان کے اپنے تنگ دھڑنگ بچے واہی تباہی گھومتے پھرتے تھے۔ لاکھ چاہو اسکول جا کے نہ دیتے۔ پڑھائی ویسے خود بنواری کو بھی کوئی خاص کارآمد مشغلہ نہیں لگا کرتی تھی۔ جو پڑھ رہے تھے وہ کون سا تیر مار رہے تھے یا مارلیں گے۔ ہاں جب سے مڈڈے میل ملنا شروع ہوا تھا وہ دوپہر کے وقت اسکول پہنچ جاتے اور پتلی کھچڑی کھا کے بھاگ نکلتے۔ کچھ بے وقوف ضرور تھے جو پابندی سے اسکول آتے۔ اور ان میں سے ایسا کوئی نہیں تھا جس نے بنواری کا نمک نہیں کھایا تھا۔ بنواری دونے میں پکوڑے رکھ کر ان پر چٹنی ڈالتے اور اس دوران لڑکے کے سارے خاندان کی خیریت پوچھتے جاتے۔ لڑکے کے پاس پیسے نہ ہوے تو ادھار دیکر بنواری اس سے کبھی تقاضہ نہیں کرتے تھے۔ گاؤں کی بھجن منڈلی کے وہ سربراہ تھے۔ پھاگن میں چیتی گانے والوں میں سب سے اونچی آواز ان کی ہوا کرتی تھی۔ بڑے سے بڑا بدمعاش سے بدمعاش لڑکے نے بھی کبھی ان کے پیسے مارے نہیں تھے خواہ ان کی رقم چکانے کے لئے کسی اور سے بے ایمانی کر کے روپیہ کیوں نہ اینٹھنا پڑ جائے۔

گھومتے پھرتے لوگوں سے ملتے ملاتے وکیل صاحب بنواری کے ہوٹل پر بھی پہنچ گئے۔ پہنچ کیا گئے راستہ ہی ادھر سے نکلتا تھا۔ 'ہوٹل' دیکھ کر وہ نہایت محظوظ ہوئے۔ تبھی اسکول کی چھٹی ہوئی تھی اور بنواری لڑکوں سے گھر گئے تھے" بنواری کاکا پچاس پیسے کے پکوڑے۔" "بنواری چاچا ایک روپئے کے پکوڑے" "بنواری بابو ایک روپئے کے پکوڑے ایک روپیہ ادھار ..." بچوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وکیل صاحب چپ چاپ کنارے کھڑے ہو گئے۔ جب غول بیابانی چھٹا تو وہ سامنے آئے' ارے وکیل بابو۔ کب سے کھڑے ہیں؟ آیئے آیئے۔ انہوں نے نہایت بے تکلفی سے دو مُگَّے نکال کر انہیں بھی ویسے ہی بٹھا لیا جیسے وہ اوروں کو بٹھایا کرتے تھے۔ دونے میں اپنے حساب سے دو ڈھائی روپئے کے پکوڑے رکھے اور چٹنی ڈال کر انہیں پیش کئے۔ پھر نام بنام سات پشتوں کی خیریت پوچھ ڈالی اور اپنی بھی بتا دی۔

''سندر یہ دہے وکیل بابو؟''

''ہاں وہ تمہارا پچیرا بھائی۔تم سے تو بہت چھوٹا تھا۔''

''پورے پندرہ برس۔اب تو تیس برس کا ہو گیا۔جوانی ڈھلنے پر آ گئی۔بیاہ ہی نہیں کرتا۔کرے تو کیسے۔جا کے چندریکا سنگھ سے مل گیا ہے۔گاؤں کی ایک لڑکی سے سگائی کردی تھی۔وہ اس کے نام پر بیٹھی ہے۔کیا کریں وکیل بابو۔ہمارے نہ لوگ نہ بہن نہ بھائی۔ایک وہی ہے اور اتنا آدر،مان دیتا ہے کہ ہم رشتہ بھی نہیں توڑ پاتے۔''

وکیل صاحب چندریکا سنگھ کے نام پر بڑے زور سے چونکے۔وہ چمپارن کا مشہور ڈکیت تھا۔دنوں دن اس کی ناموری بڑھتی جارہی تھی۔

''چندریکا تو ڈاکو ہے۔''

''یہی تو رونا ہے وکیل بابو ہماری سات پیڑھیوں میں کوئی بدمعاش نہیں ہوا۔سب سیدھے سیانے لوگ۔لگتا ہے جب یہ پیٹ میں تھا تو چاچی کسی مسان یا کبرگاہ سے گذری ہوگی۔کوئی ڈکیت تبھی مرا رہا ہوگا۔اس کی کوکھ میں آن بیٹھا۔''

''یہاں آتا جاتا ہے؟''وکیل صاحب،مزید پریشان ہوئے۔

''اب کیا کہیں۔وہ ہمارے پڑوس میں ہی رہتی ہے۔اس کی منگیتر۔پھر جب ڈاکو ارہر کے کھیت میں ڈیرا ڈالتے ہیں تو پکوڑے ہمیں سے چھنوا کے لے جاتا ہے۔''

''کیا غضب کرتے ہو بنواری۔پکڑے جاؤ گے۔چکی پیسو گے جیل میں۔ڈاکو کو کیا فرق پڑتا ہے۔تم ٹھہرے گرہست۔بال بچوں والے،محنت کی کمائی کھانے والے۔''

''ہم تو وکیل بابو،تھر تھر کانپنے لگتے ہیں وہ آجاتا ہے تو۔مگر کہتا ہے کسی نے ٹیڑھی آنکھ سے بھی بھیا کو دیکھا تو وہیں کھود کے گاڑ دیں گے۔''

''ہم تمہیں آگاہ کر رہے ہیں۔اپنے کو الگ کرلو۔''

''کیا الگ کرلیں وکیل بابو۔اس کی منگیتر کو ہم بھاہو مانتے ہیں۔پیر چھو کے ہمیں،ہماری گھر والی کو پرنام کرتی ہے۔بچوں پہ جان دیے رہتی ہے۔کب تک ہیں آپ گاؤں میں؟کرشن بن کر اس غریب سُداما کے گھر پدھاریے۔۔۔''

"تم سے مل لئے بنواری اب کل بتیا جاتا ہے۔ سسرالی رشتہ داروں میں شادی ہے۔"

"بتیا! ہوشیار رہے گا بابو۔ ادھر ڈکیتوں نے ڈاکے ڈالنے چھوڑ کر پھروتی کی رقم کے لئے لوگوں کو اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ سندر کہہ رہا تھا سالے پیسہ رکھتے ہیں بینک میں اور گہنا رکھتے ہیں لاکر میں تو اب ڈاکہ کون چیز پر ڈالا جائے پکڑ کے ٹیٹوا دباتے ہیں تو روپیہ ملتا ہے۔"

وکیل صاحب ہنسنے لگے۔ پھر سو روپے کا نوٹ بنواری کے گھٹنوں پر رکھ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "بچوں کے لئے مٹھائی لے جانا۔"

چندریکا کا گروہ بھی بتیا میں ہی سرگرم تھا۔ پھروتی کی رقم مل جاتی تو لوگ چھوڑ دیے جاتے۔ قتل کی کوئی واردات اب تک نہیں ہوئی تھی لیکن پولیس ان لوگوں پر ہاتھ نہیں ڈال پائی تھی۔ وکیل صاحب کی شامت جو آئی تو شادی کی تقریب ختم ہونے کے بعد بھی ایک دن کے لئے زمینیں دیکھنے کو رُک گئے۔ شوگر کے مریض تھے اس لئے صبح شام ٹہلنے نکلتے۔ جس دن واپس لوٹنا تھا اس دن علی الصبح کمبل ڈال کے کھینچ لئے گئے۔

ڈاکو کھیتوں کھیتوں گھومتے۔ ان کی کوئی مستقل قیام گاہ نہیں تھی۔ بتیا کے علاقے میں گھاٹیاں نہیں تھیں ارہر اور گنے کی کھیتی بہت تھی جس میں لانبے اور گھنے پودے ان کی پردہ پوشی کرتے۔ گاؤں والوں کو نقل و حرکت کی خبر ملتی بھی تو جان کے خوف سے خاموش رہتے۔

ڈاکوؤں نے وکیل صاحب سے ہی ان کے گھر والوں کو خط لکھوایا۔ فون بوتھ اور موبائل عام نہیں ہوئے تھے بلکہ موبائل تو قطعی نہیں آئے تھے۔ اس لئے پھروتی ہمیشہ خط کے ذریعے مانگی جاتی۔ رقم اور اس کی ادائیگی کے طریقے کی پوری وضاحت کر دی جاتی تھی۔ وکیل صاحب بارسوخ آدمی تھے لیکن ان کی جان کو خطرہ لاحق سمجھ کر گھر کے لوگ بہت احتیاط اور سست رفتاری سے کام کر رہے تھے چاہ رہے تھے کہ پولیس درمیان سے ہٹ جائے اور رقم ادا کر کے ہی گھر کے سربراہ کو چھڑا لیا جائے۔ بیوی بچوں کا رو۔ رو کر بُرا حال تھا۔

چندریکا سنگھ نے وکیل صاحب کو مشرقی اور مغربی چمپارن کے انہیں گنے اور ارہر کے کھیتوں کے درمیان دوڑا رکھا تھا۔ ادھر وکیل صاحب کے جوڑوں پر گٹھیا کا بھی اثر ہو چلا تھا۔ اتنا چلنے کی عادت بھی نہیں تھی، ٹہلا ضرور کرتے تھے۔ ادبڑ کھابڑ زمین پر کئی کئی کلومیٹر چلنا

پڑتا، وہ بھی شانے جھکا کر تو پیر سوج جاتے۔ گھٹنوں پر ورم آ جاتا تو ایک ڈاکو کڑوا تیل گرم کر کے ان کے پیروں پر مالش کرتا۔ تیار رہئے وکیل بابو۔ کل تو دس کلومیٹر سے کم نہیں دوڑائیں گے۔ یہاں پولیس نے خاص خبری چھوڑ رکھے ہیں۔ زیادہ ٹھہرے تو مارے جائیں گے۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ ہمیں کیسے پتہ۔ ہمارے بھی تو خبری ہیں۔'' وہ قہقہہ لگا کر زور سے ہنسا۔

نوجوان ہاتھوں سے گرم تیل کی مالش نہایت سکون بخش تھی۔ وکیل صاحب کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ 'خوش رہو' انہوں نے بے اختیار ڈاکو کو ایسے دعا دی جیسے اپنے خاص ملازم کو دیا کرتے تھے۔ پھر بولے 'ارے بھیا کچھ بھگوان کا ڈر خوف ہے کہ نہیں۔ ہمیں کیوں پکڑ رکھا ہے۔ ہمارے ساتھ اپنی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ کیوں حرام کی کمائی کھاتے ہو۔'

لڑکے کے چہرے پر تمسخر کے آثار نظر آئے۔ پھر وہ دوبارہ کھلکھلا کر ہنسا۔ 'بھگوان کا ڈر آپ کو ہے وکیل صاحب؟ دودھ کا پانی اور پانی کا دودھ کر کر کے راج محل بنوائے ہوئے ہیں، زمینیں خریدتے جا رہے ہیں اور سنا کہ بہنوں کو جائداد میں حصہ نہیں دے رہے۔ آخر جائیں گے تو خالی ہاتھ نہ۔ پھروتی کی رقم جلدی منگوا لیجئے تو مرتے سمے بال بچوں کا مونہہ دیکھتے ہوئے پران آسانی سے نکلیں گے۔ ودھی ودھان کے ساتھ کریا کرم بھی ہو جائے گا ورنہ یہیں گنے کے کھیت میں توپ دیے گئے تو بھوت بن کر بھٹکیں گے۔ لائیے ہاتھ دیجئے ادھر۔'' اس نے انگلیوں پر بھی گرم تیل لگایا تو نظر ایک بار پھر داہنے ہاتھ کی درمیانی انگلی پر پڑی۔ بڑے نگینے کی دپ دپ کرتی انگوٹھی صورت سے ہی بہت قیمتی لگتی تھی۔

''وکیل صاحب یہ کیوں پہنتے ہیں؟'' اس نے انگوٹھی والی انگلی پکڑ کر پوچھا۔

''ہمارے اندر منگل دوش ہے۔ جیوتشی مہاراج نے پکھراج پہننے کو کہا تھا۔''

''کتنے میں خریدی؟ پھر قہقہہ لگا کر بولا خریدی یا پھر ٹھگی ہے؟''

''بہت دامی ہے۔'' وکیل صاحب اتنا ہی بولے پھر سوچا اب سر سے انگوٹھی مانگ کر لینا ٹھگنا تو نہیں ہوا۔

''منگل دوش تو ہمارے اندر بھی ہے۔ نہ گھر نہ دوار۔ بگولے بکائن کی طرح گھومتے

پھرتے ہیں۔ لایئے انگوٹھی ادھر دیجئے۔" سندر پھر ہنسا اور انگوٹھی اتار لی جو تیل کی وجہ سے نہایت آسانی سے سرک آئی تھی۔

اس دن وہ لوگ مشرقی چمپارن میں تھے۔ شام کو بڑے اطمینان سے سندر پتاہی پہنچ گیا۔ بھائی کی کڑھائی کے پاس آ کر پورے تسلے کا بیسن تلوالیا۔ انگوچھے میں پکوڑے باندھ کر کیلے کے بڑے سے دونے میں ساری چٹنی انڈیلی۔ پھر اس نے انگلی سے وکیل صاحب کی انگوٹھی نکال کر بنواری کی انگلی میں پہنا دی اور سو سو کے دو نوٹ بھی وہیں پلیا پر دھر دیے۔ یہ پکوڑوں کے دام ہیں۔ کل کے لئے تیل بیسن لے آنا۔ انگوٹھی رمیا کو دے دینا۔ سنار سے اپنے مطابق چھوٹی کرالے گی۔ ابھی اس کے پاس جانا مناسب نہیں۔ وہ پیر چھونے کو جھکا۔

'ہمارے پاس آنا مناسب تھا کیا' بنواری نے بڑے بھائی کی حیثیت سے اسے ڈانٹا۔ سندر مسکرایا۔ اس کا سیاہ چہرہ غضب کا ملیح تھا۔ ہنستا تو سفید چمکیلے دانت چہرے پر بجلی دوڑاتے چلے جاتے۔ کتنی بار کہیں بھیا ہم سے سوال جواب مت کیا کرو۔ اور پکوڑے سنبھال کر چلتا بنا۔

سندر کے جانے کے کوئی گھنٹہ بھر بعد داروغہ آن نکلے۔ انہیں چکھنا لینا تھا۔ آج ولایتی بوتل کھلی تھی۔

"اتنی جلدی سب جھاڑ پونچھ کے چھٹی؟" انہوں نے ذرا مشکوک نظروں سے بنواری کو گھورا۔ فوراً ہی نظر اس انگلی پر پڑی جس میں ایک قیمتی نگ والی انگوٹھی چم چم کر رہی تھی۔ کتنی قیمتی ہوگی یہ تو پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا لیکن لگ رہی تھی نہایت بیش قیمت (اصلی پکھراج ٹھہرا)۔ شکل سے ہی راجسی لگ رہی تھی۔

"اب ڈکیتی میں حصہ بھی لگنے لگا۔" انہوں نے اس کی پسلیوں میں ٹہوکا دیا اور انٹی کھلوائی۔ وکیل صاحب کا دیا نوٹ ابھی خرچ نہیں کیا تھا ساٹھ ستر بکری ان کے تھے۔ اتنی رقم، اور انگوٹھی کہاں سے آئی؟ اتار۔ انہوں نے انگوٹھی اتروا کر جیب میں ڈال لی اور روپے بھی رکھ لئے۔

''سندر کہاں ہے آج کل؟''

بنواری رونے لگا۔ ''مر جائیں گے ہجور۔ سب پیسوا مت لیجیے۔ کل دوکان کیسے لگائیں گے۔ بال بچہ کیا کھائے گا۔''

''سندر کہاں ملے گا؟''

''ہم کیا جانیں ہجور۔ یہ تو آپ ہی پتہ کریں گے۔''

''اس چھنال، چندریکا سنگھ کی رکھیل رمیا کو دھرنا ہوگا تب صحیح پتہ چلے گا۔''

سندر کی محبوبہ کو بنواری اپنی 'بھاہو' مانتا تھا۔ وہ گھر آتی تو بنواری اور اس کی بیوی کے پیر چھوتی، دروغہ نے اسے چھنال کہا تو کسی ایسی چیونٹی کی طرح جو دب کر کاٹ لے، بنواری کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر تن گیا اور تیز لہجے میں بولا۔ ''دروگہ جی جبان سنبھال کر بات کیجیے اور انگوٹھی بھی واپس کیجیے۔ ہم ایسے نمردو بر نہیں ہیں۔''

جواب میں دروغہ جی نے اسے تابڑ توڑ کئی ڈنڈے لگائے اور مجرموں کا ساتھ دینے و پولیس افسر کے ساتھ گالی گلوج کرنے کے الزام میں لے جا کر حاجت میں بند کر دیا۔

یہ سارا گاؤں جانتا تھا کہ سندر باقاعدہ چندریکا سنگھ کے گروہ میں شامل ہے لیکن پھر سارا گاؤں یہ بھی جانتا تھا کہ بنواری کا اس کی ڈکیتیوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اس کی گرفتاری کی خبر دوسرے دن دوپہر تک گاؤں میں گشت کر گئی۔ ادھر کچھ دن سے پتاہی بلکہ چمپارن کے کئی حصوں میں سیاسی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ آئے دن جلسے جلوس۔ الیکشن قریب تھے۔ لونڈوں کو بڑا مزا آتا تالیاں بجاتے ساتھ ہو لیتے۔ کوئی مقامی نیتا تقریر کرتا ہوتا تو کبھی زندہ باد کبھی مردہ باد۔ پھر قہقہے لگاتے چل دیتے۔

تین منزلہ پختہ مکان میں رہنے والے گاؤں کے سربرآوردہ کنبے کا لڑکا جو بچپن میں بنواری کے پکوڑے کھا کر بڑا ہوا تھا۔ اور اس کی بھجن منڈلی میں کھڑتال بجایا کرتا تھا پٹنہ میں پڑھ رہا تھا اور آج کل چھٹیوں میں آیا ہوا تھا۔ اس نے کچھ نوجوانوں کو بٹورا اور تھانے چلا آیا۔

''بنواری کو کیوں گرفتار کیا چچا؟'' اس نے دروغہ سے پوچھا۔

''اس دوکوڑی کے پکوڑے والے سے آپ کو کیا لینا دینا، اشوک بابو'' اشوک کے دادا ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر کے افسروں کے ساتھ مل کر آتے تھے اور خیتا گیری کرنے والے پتا ہی آتے تو ان کے یہاں بھوج بھات ضرور ہوتا۔ اس لئے ایک لونڈے کے ذریعے جواب طلب کیے جانے کے باوجود انہوں نے لہجے کی جھنجھلاہٹ پر قابو پانے کی پوری کوشش کی۔

''یہی تو ہم بھی پوچھ رہے ہیں تاؤ کہ اس دوکوڑی کے پکوڑے والے سے آپ کو کیا لینا دینا۔''

اب کی درروغہ جی نے خاصہ چیں بہ جبیں ہوکر جواب دیا ''ڈاکوؤں سے سانٹھ گانٹھ رکھنے والے آدمی کے بارے میں آپ ہم سے سوال کر رہے ہیں؟''

''کیا ثبوت ہے؟ ہمت ہے تو چندریکا کو پکڑیے۔ وہ بے چارہ بھگوت بھجن میں ڈوبا غریب آدمی۔'' ''ہاں ہاں چندریکا کو پکڑیے۔ چندریکا کو پکڑیے۔'' لڑکوں نے شور مچایا۔ گروہ میں رمیا کے بھائی اور اس کی برادری کے کئی اور جوان بھی تھے۔

چندریکا درروغہ کی دکھتی رگ تھا۔ ایک بار گرفت میں آگیا تھا لیکن ایسا جُل دے کر بھاگا تھا کہ داروغہ جی مونہہ دکھانے لائق نہیں رہ گئے تھے۔

انگوٹھی درروغائن کے زیوروں کے ڈبے میں رکھ دی گئی اور سندر کے حوالے سے بنواری پر سختی کی گئی۔ وہ بے چارہ دل کا مریض تھا اور یہ جانتا بھی نہیں تھا کہ اکثر اسے اچانک پسینہ کیوں آتا ہے۔ سانس کیوں پھولتی ہے اور وہ اپنی عمر سے زیادہ تھکتا کیوں ہے۔ تھانے میں اس پر دل کا دورہ پڑا اور وہ مر گیا۔ طالب علموں کی برادری نے مزید شور مچایا۔ کچھ سیاسی لوگ بھی شامل ہوئے تو داروغہ جی معہ ایک اے ایس آئی معطل کر دیے گئے۔

وکیل صاحب کو بھاری پھروتی دے کر ان کے عزیزوں نے چھڑا لیا۔

انگوٹھی درروغائن کے ڈبے میں جگر جگر کرتی رہی۔

'نیک بخت وہ انگوٹھی نکال۔' ایک دن درروغہ جی نے درروغائن سے کہا۔

'کیوں؟'

'ہم کہہ رہے ہیں اس لئے۔'

'کسی کو دے مت دیجئے گا۔'

'نہیں دیں گے تو ایک دن فاقے کی نوبت آئے گی۔ سال سے اوپر ہو گیا معطل ہوئے۔ ابھی تک انکوائری ہی چل رہی ہے۔'' انہوں نے جھڑک کر جواب دیا۔ اور ہم کیا کریں گے انگلی میں پتھر لٹکا کے۔'

اس سے پہلے ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر میں پولیس افسر ذرا نایاب نسل کے انسان تھے یعنی ایماندار۔ اب جو آئے وہ بالکل نارمل تھے۔ انگوٹھی جس کے نگ کی قیمت کوئی پندرہ بیس لاکھ آنکی گئی اور جس کی بناوٹ کو تاریخی قرار دیا گیا، دروغائن کے ڈبے سے نکل کر ایک بڑے پولیس افسر کے پاس پہنچ گئی۔ انہوں نے اسے اطمینان سے انگلی میں ڈال لیا اس لئے کہ وہ بڑے افسر تو تھے ہی، دولت مند خاندان کے داماد بھی تھے۔ ان کی انگلی میں وہ انگوٹھی دیکھ کر سوال نہیں اٹھ سکتے تھے۔ نہ ہی انگوٹھی کی اصل قیمت کا لیبل اس پر چسپاں تھا۔

داروغہ اور ساتھ کے اے ایس آئی، دونوں بحال ہو گئے۔ چندریکا سنگھ کا گروہ کچھ عرصے اور فعال رہا۔ پھر کچھ سال بعد چندریکا اور سندر دونوں پولیس انکاؤنٹر میں مارے گئے۔ سندر کی منگیتر اور محبوبہ کی پولیس کسٹڈی میں اجتماعی عصمت دری کی گئی۔

''ہم کیا سندر سے برے ہیں۔ بھول جا اسے۔ وہ مر چکا۔'' پولیس والوں نے اسے برتتے ہوئے اس کے کانوں میں کہا۔ رمیا نے چھوڑے جانے کے بعد دوسرے ہی دن خودکشی کر لی۔ انگوٹھی ابھی اس بڑے پولیس افسر کی انگلی میں جگمگا رہی تھی۔

''یار اس پوسٹنگ کے لئے تو لاکھوں چل رہے ہیں'' پولیس افسر سے اس کے ایک ہم منصب نے کہا۔

''ٹھیک ہی تو ہے یار۔ بیس پچیس لاکھ دے کر کروڑ کما لئے تو برا کیا ہے۔ پچھتر تو ڈب میں رہے۔

''تو لگ جاؤ لائن میں۔ شاید قسمت ساتھ دے جائے۔''

''ہمارے پاس ایسا گرو منتر ہے کہ آزمائیں تو پوسٹنگ ہماری جیب میں ہو گی۔''

''منسٹر صاحب کے پی۔ ایس سے بات کر کے دیکھو۔ ان کا بیٹا سارے معاملات طے کرا رہا ہے۔''

''سنا تو ہم نے بھی ہے۔''

''جوہری نے ہمیں بتایا کہ یہ اینٹیک (antique) ہے۔ لگ بھگ ڈیڑھ سو برس پرانی۔ اور اس کا نگ بدخشاں سے آیا لگتا ہے۔ اس کی بناوٹ بھی سنٹرل ایشیا کی ہے۔'' منسٹر صاحب کے پی۔ ایس کے قریبی وشو موہن جھا کو بتایا گیا۔ پھر پی۔ ایس کے صاحبزادے درمیان میں آئے۔ بات سیڑھی در سیڑھی چل کر 'تھرو پراپر چینل' (through proper channel) آگے بڑھی۔ پولیس افسر نے انگوٹھی انگلی سے اتار دی اور 'بہترین' پوسٹنگ پر چلے گئے جہاں انہیں صرف کوئلے کے مافیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لینی تھیں۔ دہلی میں ان کی بے نامی کوٹھی کا نقشہ تیار ہونے لگا۔ انگوٹھی اب منسٹر صاحب کی انگلی میں لو دے رہی تھی۔ انگوٹھی جسے ایک محنتی، ایماندار اور وفا شعار عورت نے راتوں کا تیل جلا کر مخمل کے تین سو ٹکڑوں پر زری کی باریک ترین کشیدہ کاری کر کے بدخشاں کے ایک سوداگر سے حاصل کیا تھا اور اپنے شوہر کی انگلی میں اپنی محبت کی نشانی کے طور پر ڈالا تھا۔ ساتھ ہی سوداگر نے یہ بھی کہا تھا کہ ستارہ شناسوں کے مطابق انگوٹھی کا نگینہ پہننے والے کو آفات سے محفوظ رکھتا ہے۔

☆☆

# گُڑروٹی

امی جان کے سالانہ تیرتھ کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ اگلے ہفتے روانگی تھی۔ مارچ کا آخر۔ کھیتوں میں سنہری گندم پک کر تیار ہو رہی ہوگی۔ امرائی میں آم کے درخت بورسے لدرہے ہوں گے۔ لوگ مالکن کی آمد کے لئے آنکھیں بچھائے تیار ہوں گے۔ ڈھنڈار مکان کے ایک حصے میں آباد علی میاں کا کنبہ منتظر ہوگا کہ صاحبزادی آئیں تو سال چھ مہینے کے لئے کپڑوں کا انتظام ہو۔

صاحبزادی پرانے کپڑوں کے ڈھیر پر چڑھی بیٹھی ایسی ہی لگ رہی تھیں جیسے گاؤں جا کر اس ٹوٹے پھوٹے ڈھنڈار مکان کے برآمدے میں بیٹھی لگا کرتی تھیں..... ملبے کی ملکن۔ شروع ہو گئیں امی کے حج اصغر کی تیاریاں۔ بھیا ہنستے ہوئے پاس سے گذرے۔

ارے توقیر! ذرا اپنی الماری کھولکر وہ سارے پرانے کپڑے نکال دو جواب تم نہیں پہنتے ہو۔

امی فار گاڈز سیک۔ میرے سارے کپڑے پچھلے ایک دو سال کے اندر بنوائے ہوئے ہیں۔ پچھلی وزٹ پر آپ سارے پرانے کپڑے نکال لے گئی تھیں۔ اب میری الماری مت کھولئے گا۔

بھاڑ میں جاؤ۔ کسی غریب کو کچھ دینے کے خیال سے نانی مرتی ہے۔ اور وہ پیٹ بھرے یار دوست آکے مانگ لے جائیں تو کوئی حرج نہیں۔

بھیا چڑ گئے، میرے کپڑے لے کر کوئی بھاگ نہیں جاتا اور مجھے ضرورت پڑتی ہے

تو میں بھی ان لوگوں سے مانگ لیتا ہوں۔ کبھی شرٹس، کبھی ٹائی کبھی بیلٹ۔ یاروں کا کام تو ایسے ہی چلتا ہے۔

اچھا اچھا اب تم لوگوں سے کون بحث کرے اور اولا دتھوڑی ہو، باپ ہو میرے یہ دو قمیصیں علی میاں کے لئے شلوار قمیض انکی بیوی کے لئے اور یہ گرم شال اگلے جاڑوں، دھو کے کام آئے گی۔ ایک سانس میں بولتے ہوئے انہوں نے دس برس پرانی شال الگ کی جو تیلی ہونا شروع ہوگئی تھی اور باریک باریک چھیدوں کی وجہ سے اس کی شکل کسی بوڑھے کے دانت ٹوٹے منہ جیسی لگ رہی تھی۔

کتنی بار امی کو کہا کہ اس چھیدوں والے پتلے پڑتے مکان اور ادھر ادھر بکھری جوڑ پیوند جیسی زمینوں کو بیچ کر برابر کریں۔ یہاں شہر والے مکان میں توسیع کی جائے، کچھ اس کی شکل بہتر بنائی جائے یا پھر کچھ اور روپیوں کا کسی طرح انتظام ہو جائے تو کسی کثیر منزلہ عمارت میں ایک فلیٹ لے لیا جائے۔ مکان کی توسیع کا بیٹھ بیٹھ کر نقشہ بنایا جاتا رہتا تھا۔ اوپر ایک پوری منزل اس طرح اٹھانی تھی کہ دو دو کمروں اور ملحقہ غسل خانوں کے ساتھ ایسے مکمل یونٹ تیار ہو جائیں کہ دو کنبے آرام سے رہ سکیں۔ بھابی باورچی خانے اور غسل خانے میں ٹائلز لگوانا چاہتی تھیں۔ ابا ریٹائر ہو چکے تھے، بھیا وکالت کر رہے تھے اور ابھی انکی آمدنی زیادہ نہیں تھی۔ دو غیر شادی شدہ بہنیں تھیں۔ اس لئے مکان میں کچھ کرنے کی بات تب ہی کی جا سکتی تھی جب امی گاؤں والا گھر اور کھیت بیچنے کو راضی ہوں۔

شادی کے چند سال بعد سے ہی ابا نے بولنا بہت کم کر دیا تھا۔ خاص کر اماں کے معاملات میں۔ کچھ اور وقت گذرا تو وہ اپنے خول میں اور سمٹ گئے پھر بالکل خاموش اور گوشہ نشیں ہوگئے۔ اماں گھر میں مطلق العنان ملکہ تھیں ویسے حکم چلانے کی عادت انہیں ہمیشہ سے تھی۔ زمین دار گھرانے کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ باپ کے علاوہ انہیں منجھلے چچا کی جائیداد کا کچھ حصہ بھی ملا تھا منجھلے چچا لاولد تھے۔ شراب اور مصاحبین میں سارا کچھ برباد نہ کیا ہوتا تو اماں کو اور بہت کچھ دے جاتے۔ بڑے چچا کی اولادیں ہمیشہ منجھلے چچا اور ماں دونوں سے خار کھاتی رہیں۔ پھر وقت سب کو کھا گیا۔ خاتمہ زمین داری کے بعد بہت

سی جائیداد ختم ہوگئی۔ تقسیم وطن کے بعد کچھ کسٹوڈین کی نذر پہلے ہی ہوچکی تھی۔ کچھ ماموؤں نے اماں کی اجازت کے بغیر خرد برد کردی۔ بیویوں کے سونے کے زیورات بنائے روپیہ پہونچانے کا انتظام کرایا اور سرحد پار چلے گئے۔ یہ تینوں اماں کے سگے بھائی تھے۔ اب بچی کھچی جائیداد سے وہ یوں چمٹی ہوئی تھیں جیسے ڈوبتی ہوئی کشتی کا مسافر کسی تختے کے ٹکڑے سے چمٹ جاتا ہے۔ ویسے کھیت کافی تھے۔ لیکن نہ کوئی دیکھنے والا نہ کوئی بھالنے والا۔ اماں ''منیجر صاحب'' کا ذکر بڑے طمطراق کے ساتھ کیا کرتی تھیں جو ''لوپ لائن'' سے اماں کے رشتے دار بھی تھے۔ اماں کے نانا بلکہ ان کے والد کی جوانی کے وقتوں تک بھی یہ لوپ لائن ایک تمغہ تھی جسے اکثر زمین دار بڑے فخر کے ساتھ اپنی چھاتی پر سجایا کرتے تھے۔ خود اماں دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ منیجر صاحب کی وضاحت کیا کرتی تھیں ''وہ زمین دار ہی کیا جس نے دو چار عورتیں نہ رکھ چھوڑی ہوں۔ نانا حضرت نے بھی دو شادیاں کی تھیں اور ایک یوں ہی ڈال رکھی تھی علی میاں عرف الن میاں عرف منیجر صاحب اسی سے تھے۔ چار لڑکیاں بھی تھیں۔ دو تو صغیر سنی میں مرگئیں۔ تیسری نہ جانے کیسے ایک فلم والے کے ہتھے چڑھ گئی۔ مواجلیا رہا ہوگا۔ اس اللہ میاں کے پچھواڑے بسے گاؤں میں فلم والا کہاں سے آتا۔ بہر حال وہ اس کے ساتھ بھاگ کر بمبئی چلی گئی تھی پھر اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ الن میاں اس بہن کا نام تک نہیں لیتے تھے کہتے تھے تین مرگئیں چوتھی اور سب سے چھوٹی بچی رہ گئی تھی۔ اسے بہت چاہتے تھے وہیں گاؤں میں کسی معمولی کاشتکار کے کارندے سے بیاہی گئی عسرت اور تنگدستی کی زندگی گذار رہی تھی۔

اماں لفظ کاشت کار بڑی حقارت کے ساتھ ادا کیا کرتی تھیں گرچہ بیشتر کاشت کار گھرانوں پر زمین داری جانے کے بعد اثر نہیں پڑا تھا اور آج وہ نسبتاً زیادہ خوشحال تھے۔

تو امی الن میاں تو آپ کے ماموں ہوئے۔ یہ آپ منیجر منیجر کیوں کرتی رہتی ہیں۔ بھیا اکثر شرارت سے اماں کو چھیڑتے تھے۔ اس کا جواب وہ صاف ٹال جاتیں۔ الن ماموں نے منیجر کا درجہ خود ہی قبول کرلیا تھا اماں کے ماموں بننے کا خواب انہوں نے کبھی نہیں دیکھا گرچہ وہ در پردہ خود کو سید کہتے اور اس رشتہ داری پر فخر کیا کرتے تھے لیکن اماں کے

سامنے ہاتھ جوڑے بھیگی بلی بنے کھڑے رہتے۔ اماں گاؤں جاتیں تو وہ نہایت ادب سے فصل کی تفصیلات پیش کرتے۔ وہ تخت پر جلوہ افروز ہوتیں جس کا ایک پایہ اکڑ کر کچھ اونچا ہوگیا تھا اور تخت کسی گٹھیا کے مریض کی طرح اچکتا رہتا تھا۔ سامنے الن میاں ہاتھ باندھے عہد زمین داری کے کسی کارندے کی نمائندگی کرتے ان کے التفات کے منتظر رہتے۔

''صاحبزادی! اس مرتبہ گیہوں کو پالا مار گیا تھا۔ خط ملا ہوگا آپ کو۔ بڑی مشکل سے دس من گیہوں آپ کے حصے کا بچا۔ مسور کی فصل کچھ اچھی ہوئی تھی لیکن مسور کے دام گر جانے کے سبب پانچ سو روپے بھی مل گئے سو غنیمت جانیے۔'' وہ ایک کرم خوردہ رجسٹر میں لکھا الٹا سیدھا حساب اماں کو سمجھاتے رہتے تھے۔ پھر ٹیپ کا بند:

''صاحبزادی! ان چینگی پوٹوں کی پرورش بھی تو آپ کے دم سے ہی ہو رہی ہے۔''

حویلی کی دیکھ بھال کے لئے الن میاں نے اپنے ایک ننھیالی رشتہ دار مدھوجی جن کا پورا نام مدھوسودن داس تھا کو ایک زمانہ پہلے لا کر یہاں رکھ دیا تھا۔ جہاں ڈیوڑھی پر ہاتھی جھولتا تھا وہاں منحنی سے فاقہ زدہ مادھوجی بندھے ہوئے تھے۔ بس گھر کا وہی گوشہ آباد تھا اور لپا پتا ذرا صاف ستھرا بھی۔ باقی جگہ چوہوں، چمگادڑوں، کبوتروں، مینڈکوں اور طرح طرح کے حشرات الارض کے قبضے میں تھی۔ اللہ میاں کی جھاڑو پھر گئی تھی پوری حویلی پر۔ اور اس جھاڑو پھری حویلی کی کرم خوردہ ڈیوڑھی میں پڑے اٹنگے تخت پر بیٹھ کر اماں خود کو برٹش عمل داری کے وقت کی زمیندارن سمجھتی تھیں کہ اب بھی کچھ زمین پھولن کے قبضے میں تھی۔ کچھ ہرکھو کے کچھ رام کھلاون کے۔ اور کچھ زینومیاں عرف جنوا کے۔ گاؤں میں رہنا تو اماں کے والد کے وقت سے ہی کم ہوگیا تھا۔ انہوں نے قصبے میں لانبا چوڑا مکان تیار کرایا تھا جو کوڑواڑ ہاؤس کہلاتا تھا۔ اس کوڑواڑ کی بھی ایک تاریخ تھی۔ سنا تھا ایک مغل شاہزادے نے یہ بستی بسائی تھی۔ ترل ترل بہتی گومتی کی دھار کے ساتھ لگے چلے گئے ہرے بھرے جنگلات اور رنگ برنگے خود رو پھولوں کی فراوانی کی وجہ سے اس کا نام رکھا ''کوئے بہار'' وقت گذرنے کے ساتھ وہ کوئے بہار سے کوڑواڑ ہوگیا اور کچھ ستم ظریف اسے ''کوڑے بھاڑ'' کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ دیہاتوں میں یہ نام بہت مقبول ہوگیا۔ مسلمان حکمرانوں کی پوری

تاریخ کوئے بہار سے گذرتی ہوئی کوڑے بھاڑ پر ختم ہوگئی تھی۔ مگر بہت سے لوگوں کی طرح اماں بھی ابھی تک کوڑے سے چمٹی ہوئی تھیں۔

ابا نوکری پیشہ خاندان سے تھے۔ زمیں داروں کے لونڈے اس قدر ناکارہ اور اوباش نکل رہے تھے کہ اماں کے والد نے اپنی بیٹیوں کو غیر زمین دار خاندانوں میں بیاہا بس ہڈی کی پڑتال اچھی طرح کرلی تھی۔ اماں پھر بھی ساری عمر ابا کو اپنی رعیت ہی سمجھتی رہیں۔ بلی چونکہ اماں نے پہلے دن ہی ماردی تھی اس لئے ابا ان سے بہت ڈرتے تھے گرچہ تنہائی میں انہیں ناقص العقل کہا کرتے تھے۔ لڑکوں نے بڑے ہوکر ان کے اس خیال سے اتفاق کیا تو ابا کو بڑی کمینی سی مسرت کا احساس ہوا۔ ابا کی کبھی ہمت نہیں ہوسکی تھی لیکن لڑکے بڑے ہوکر یہ بھی کہنے لگے تھے کہ اس کرم خوردہ کمبل یعنی گاؤں کے کھیتوں اور مکان کو بیچ دیا جائے تو حاصل شدہ رقم کو کہیں لگا کر یا مکان کی توسیع کرکے زیادہ منافع حاصل ہوسکتا ہے۔ مگر اماں کو وہ منافع بہت عزیز تھا جو وہ ہر سال وہاں جاکر سمیٹ لایا کرتی تھیں۔ مالکن کہلانے کا غرور۔ مادھوجی کے پورے کنبے سے مکّی چنّی کرانے کی مسرت۔ برکھو، جنو اور پھولن کی عورتوں میں پرانی ساریاں تقسیم کرکے ان کی تشکر بھری نظروں سے ملنے والا بڑپن کا احساس۔ ان آنکھوں میں اب بھی تخت مرعوب ہونے والی کیفیت تھی بلکہ ابا کو سرکاری نوکری ملنے اور ان کے کنبے کے لکھنؤ میں بس جانے کے بعد ان کا رعب داب کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ سب کی مخالفت کے باوجود اماں نے گھر کی پہلی شادی کوڑواڑے سے کی۔ گاؤں سے کمیوں کے غول کے غول آئے۔ مہینہ بھر مہمان داری رہی۔ سکو اماں نے پیلی دھوتیاں دیں۔ چلتے وقت ڈلیا بھر بھر سیدھا اور کچھ روپے۔ عہد زمین داری کی یاد تازہ اٹھی۔ یہ سب اماں کی رعیت تھے۔ اماں کے ٹٹ پونجئے سسرال والوں پر خوب رعب پڑا۔ وہ بیچارے تو پہلے ہی مارا ہوا شکار تھے۔

"ہم نے کبھی گھر کا کام نہیں کیا تھا۔ اماں بڑے فخر سے بتایا کرتی تھیں۔ دو چھوکریاں صرف ہمارے اوپر ملازم تھیں ایک بال دھوکر سکھاتی تھی دوسری ہمارا بدن دبایا کرتی تھی۔"

ایک بار ابا کی شامت آئی تو بول پڑے کون سا کام کر کے آپ تھکتی تھیں جو بدن دبانے کی ضرورت پڑتی تھی۔

"کام کر کے مزدورنیں تھکتی ہیں اور ملازمائیں۔ زمین داروں کی بہو بیٹیاں نہیں۔" اماں نے رکھائی سے ٹکا سا جواب دیا تھا۔

"گاؤں کے چماروں کا چودھری جب آتا تھا تو گھر کے پھاٹک میں داخل ہونے سے پہلے ہی جوتے اتار کر ہاتھ میں لے لیتا تھا اور سلام کرتا گھستا تھا خواہ کوئی سامنے ہو یا نہ ہو۔" ترنگ میں اماں پرانے قصے لے بیٹھتی تھیں۔

"یعنی درودیوار کو سلام کرتا ہوا... ؟" لڑکوں میں سے کوئی لقمہ دیتا۔

"اب جو سمجھ لو۔ جلاہوں کی بستی میں جب کوئی شادی ہوتی تو ہمارے یہاں ایک چھوٹی دیغ خصی کا گوشت، ایک ہانڈی کھڑے ماش پکے ہوئے، گیارہ خمیری روٹیاں، اور ایک ہانڈی دہی بطور نذر آتا تھا۔"

"وہ بیچارے اتنا سب کہاں سے کرتے تھے اماں؟"

"اب جہاں سے بھی کرتے ہوں۔"

"اماں مجھے گھن آتی ہے ان باتوں سے۔ آپ لوگ بڑے آدمی تھے صرف اس لئے کہ آپ کے پاس زمینیں تھیں۔"

"نہیں صرف اس لئے نہیں، اس لئے بھی کہ ہم سید ہیں۔"

"سید ہونے سے کون بڑا ہوا ہے امی۔ اور پھر کون کتنا سید ہے۔ وہ آپ کے ماموں کم منیجر سید علی میاں، عرف الن، مدھوسودن داس کے بھانجے۔"

"وہ موا سید کہاں سے ہو گیا ملّازادہ۔"

"اپنی امی سے بحث مت کیا کرو۔" ابا نے ایک دن رسان سے کہا تھا "جو اقتدار کھوتے ہیں وہ اور جن کے ہاتھوں میں نیا نیا اقتدار آتا ہے۔ وہ بھی۔ میاں ان دونوں میں سے نارمل کوئی نہیں رہ جاتا۔ انہیں اس کا عادی بننے میں کچھ وقت لگتا ہے۔"

"کچھ بھی ہو مگر اس دیمک لگے کوزوا ہاؤس اور اس سے بھی زیادہ دیمک لگے

بلکہ زمین بوس ہوئے گاؤں کے مکان اور زمین کی چندیوں کو رکھنے کی کوئی تک نہیں ہے۔''

''میرے بعد جو جی چاہے کر لینا۔'' اماں کا دوٹوک جواب تھا۔

''بشرطیکہ آپ کے بعد اس میں سے کچھ بچا رہے۔ سرکار جلد ہی نیا قانون بنانے والی ہے کہ جو لوگ زمین جوت رہے ہیں زمین انہیں کی ہو جائے گی۔ الن ماموں کے رشتے داروں نے نہ جانے کتنی چیزوں کا کباڑا کر دیا ہے۔ مکان بھی وہ بیچ لیں گے اور پھر وہ آپ کے بچازاد.....''

''میرے بچازاد بیچاروں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ کم از کم گھر میں چراغ تو جلا رہے ہیں۔ سال کے سال میلاد بھی کرتے ہیں۔''

''ہاں وہ سب جانتے ہیں کہ بڑی آپا کے مرنے کے بعد وہ کوڑ واڑ ہاؤس کے کوڑے کر لیں گے۔ اس لئے کہ ان کی اولادوں میں اتنا بوتا کہاں سے آئے گا کہ یہاں آئیں کورٹ کچہری کریں۔ گواہ اکٹھے کرتے پھریں۔ ٹکے کی چڑیا نو ٹکے ہشکائی۔ اسی لئے سال کے سال آپ وہاں جاتی ہیں تو وہ آگے پیچھے پھرتے ہیں بساط بھر خاطریں کرتے ہیں۔ بڑی آپا جو ٹھہریں اور بڑی بھی اتنی کہ ماں جیسی۔''

اماں تو ویسے بھی سب کو دیکھ ہی آتی تھیں۔ پھٹے پرانے بھی اور نئے بھی۔

اب اس وقت بھی تین بکسے، دو بڑی بڑی بوریاں، پان دان، بڑا سا ناشتہ دان، ہولڈال، دو چار گٹھریاں اور نہ جانے کیا کیا الم غلم تیار رکھا تھا۔ شہر جا کر گاڑی بدلنی ہوگی۔ وہاں سے کوڑ واڑ کے لئے بس پکڑنی ہوگی پھر اندر گاؤں میں جانے کے لئے ٹیکسی کرنی ہوگی۔ ٹیکسی اسٹینڈ سے دو کوس بیل گاڑی کا سفر، بڑے بھیا صاف کنی کاٹ گئے تھے۔ پکڑے گئے شفیق میاں اور بڑے بھیا کی دلہن جن کی پچھلے برس شادی ہوئی تھی۔ شفیق میاں پچھلے آٹھ برسوں سے گاؤں نہیں گئے تھے۔ رہیں دلہن تو نئی ٹھہریں۔

الن میاں نے گھر حسبِ مقدور صاف کرا رکھا تھا۔ جو کبھی باورچی خانہ ہوا کرتا تھا اس کی چھت ڈھے گئی تھی اس لئے آنگن کے ایک کونے میں نیا چولہا بنوا کر لیپ پوت دیا تھا۔ اوپر بانس کھڑے کر کے چھپر ڈال دیا تھا۔ تانبے کے برتنوں کا صندوق کھول کر برتن

نکالے لیکن گاؤں میں قلعی کی سہولت نہیں تھی۔ کوڑواڑ میں بھی نہیں اس لئے شہر جانا پڑا تھا
پچھلی بار اماں کوڑواڑ سے شادی کر کے لوٹ گئی تھیں۔ گاؤں نہیں آسکی تھیں۔ ان ڈھائی
برسوں میں سارا کچھ، کچھ زیادہ ہی ڈھے گیا تھا۔ الن میاں زیادہ بوڑھے لگ رہے تھے۔
مکان میں حشرات الارض اور مادھو جی کی اولادوں میں غیر ضروری اضافہ ہوا تھا۔ دیواروں
میں روزن بڑھ گئے تھے چھتیں زیادہ ٹپکنے لگی تھیں۔ ویسے چھتیں تو تقریباً سبھی ختم تھیں۔
دو چار برساتیں اور پڑیں تو بالکل ہی ڈھے جائیں گی۔ کھیت سے چماروں نے مٹی کاٹ لی
تھی۔ پانچ سات آم کے درخت تھے جو شاید پھل نہیں دے رہے تھے یا لوگوں کو پھلوں سے
زیادہ لکڑی درکار تھی اس لئے لوگ سب کاٹ لے گئے تھے۔ سکھو پاسی پانچ بیگھہ میں گیہوں
اگا رہا تھا لیکن پچھلے کئی سالوں سے ایک دانہ نہیں دے رہا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا فصل
اچھی نہیں ہوئی پچھلے سال بہیا آ گئی تھی۔ اس سے پہلے سکھاڑ پڑ گیا تھا۔ اس سے پہلے سال
الن میاں آدھی فصل اٹھا لے گئے تھے۔ جیسے الن میاں بھی بہیا سکھاڑ ٹنڈی دل قسم کی کوئی
چیز تھے۔

اماں نے انہیں بہت ڈانٹا۔ یہ کیا حال ہو رہا ہے ہر چیز کا؟ کہیں نظم نام کی کوئی چیز
ہے؟ کوئی قاعدہ قانون ہے؟

واہ اماں واہ۔ شفیق ہنسنے لگے۔ پورے ملک میں قاعدہ قانون نام کی کوئی چیز نہیں
رہ گئی۔ جس کے جو ہتھے لگ رہا ہے لئے بھاگا جا رہا ہے۔ آپ یہاں اس اجاڑ بستی میں
قانون ڈھونڈ رہی ہیں۔

کچھ ہی عرصہ پہلے گاؤں سے کچھ لوگ مقدمے کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے
انہوں نے بتایا تھا کہ مقامی سربرآوردہ اور متمول کاشتکار لعل خاں کو کسی نے خبر دی کہ لوگ ان
کی کھڑی فصل کاٹ کے لے جا رہے ہیں۔ وہ پانچ سات لٹھیت اور دو جوان بیٹے لے کر
دوڑے گئے جب تک پہونچے سنہری، پکی لہلہاتی گیہوں کی فصل کی خاصی بڑی مقدار
کٹ چکی تھی۔ لاٹھیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے دو رائفلیں موجود تھیں۔ لٹھیت الگ تیار تھے۔
لعل خاں نے حیرت سے دیکھا۔ سب جانے پہچانے لوگ تھے۔ اور سورج، اس

کے پرکھے تو ان کے کھیتوں پر پشتوں سے کام کرتے آئے تھے گرچہ عرصہ سے اس کی سن گن نہیں تھی لیکن اس وقت وہ ان لوگوں کا سرغنہ بنا کھڑا تھا۔ کالا بھجنگ اٹنگی دھوتی، سر پر لال چار خانے کا انگوچھا۔

''سورج!'' ان کے لہجے میں غصے سے زیادہ حیرت تھی۔

ہاں کھاں صاحب، سب کشل منگل ہے نہ؟ اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ خان صاحب کی حیرت بڑھ گئی سورج تو کیا اس کے خاندان میں کسی نے بھی انہیں سرکار کے علاوہ کچھ اور کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ نہ اس طرح برابری سے خیریت دریافت کی تھی۔

''تم جو کر رہے ہو اس کے بعد ہیم کشل پوچھتے ہو، کچھ تو لحاظ کرو۔''

سورج نے اپنے لٹھیتوں پر نظر ڈالی اور ایک رائفل بردار کو مخاطب کیا۔ ''پرانے سمبندھ ہیں اب کھان صاحب کو بھوکا تو نہیں مار سکتے۔ اس نے بڑے مربیانہ انداز میں کہا ''دس بیس بورا گیہوں ان کے گھر بھی پہونچا دینا اور بھابھی کو پرنام کہنا۔'' یہ 'بھابھی' بھی بڑا معنی خیز تھا۔

''کامریڈ، آپ کہہ رہے ہیں تو پہونچا دیں گے۔'' اس نے خشمگیں نظروں سے خان صاحب اور ان کے حواریوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا لیکن رائفل کی نال نیچی نہیں کی۔

لٹھیتوں نے اپنی لاٹھیاں نیچی کر لیں۔ لعل خاں واپس آ گئے۔ کچھ بھی بولنا بیکار تھا۔ بلکہ خون خرابے کا سبب بن سکتا تھا۔

دوسرے دن شام تک خان صاحب کے گھر گیہوں کے بیس پچیس بورے آ کر تلے اوپر رکھ دیے گئے۔ سورج بھان زبان کا پکا تھا لیکن وہ نہر کنارے کی کئی ایکڑ زرخیز زمین تھی۔ اتنا گیہوں تو اس کے ایک کونے کی پیداوار تھا۔ لعل خان نے اپنے ابلتے ہوئے پٹھانی خون کو ٹھنڈا رکھنے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔ گھر میں جوان بہو بیٹیاں تھیں، چھوٹے بچے تھے۔

لعل خان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک سلسلے کی تمہا کڑی تھی۔ جو ہو رہا تھا اس کے

اسباب کی گہرائی اور نتائج کی دوررسی پر اماں کی نظر نہیں تھی۔ لعل خان بحیثیت فرد ان کے دائرے میں نہیں تھے۔ بس حاشیائی حیثیت رکھتے تھے چونکہ اسی گاؤں میں رہتے تھے۔ زمین ان کے پاس بہت تھی اس لئے اماں کو ان سے لاشعوری طور پر کچھ کد بھی تھی۔ اس لئے واقعے کو انہوں نے ڈکیتی کا عام سا کیس قرار دیتے ہوئے یکسر نظر انداز کردیا اور دوسری شکایت جڑی:

''دالان کی چھت بھی ڈھے رہی ہے''

''اماں چھت تو ملک کی بھی بیٹھ رہی ہے۔''

''ارے چپ ہوگا کہ نہیں، افلاطون کے بچے۔ میں الن میاں سے کہہ رہی ہوں۔ کیوں منیجر صاحب......''

اماں نے الن میاں کو بہت ڈانٹا۔ جب معلوم تھا کہ دلہن بھی آرہی ہیں تو دو ایک چھتوں کی مرمت کیوں نہیں کرائی۔

اب ہر چیز کے لئے تو روپیہ چاہئے صاحبزادی جو اس غریب کے پاس ہوتا تو وہ میلے انگوچھے سے آنسو پونچھنے لگے۔

شام ہوتے ہوتے مالکن کی آمد کی خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ بہت سی عورتیں اماں سے ملنے آئیں۔ کچھ گھونگھٹ کاڑھ کر اور کچھ کھلے منہ لپیے ہوئے فرش پر اکڑوں بیٹھیں۔ مالکن، ملکن کرکے انہوں نے اماں کے پیر چھوئے۔ چوڑی دار پاجامے اور لمبے جوڑے پیوند لگے چادر جیسے دوپٹے اوڑھے مسلمان خواتین بھی تھیں۔ اماں نے تخت پر بیٹھ کر اجلاس شروع کیا۔ بڑے فخر سے بہو کی طرف دیکھا جس نے حسب حکم گھونگھٹ نکال لیا تھا۔

دوسرے دن اماں نے کچھ مزدور طلب کئے کہ کم از کم ایک بڑے کمرے کی کھپریل تو درست کرادی جائے۔ خاندانی قبرستان کی چہار دیواری کی مرمت بھی کرانی تھی الن میاں لوگوں کو پکڑ لائے تھے ان سب کے باپ دادا اماں کے باپ دادا کے وقت سے بیگار اور مزدوری کرتے چلے آئے تھے۔ جھنوا کے دادا کو اماں کے دادا نے پیڑ سے باندھ کر جوتے لگوائے تھے۔ مزدوروں میں جھنوا کا جوان بیٹا بھی تھا اور دس سالہ پوتا بھی۔

''پاپا۔ بڑے کے ہنڈے میں گوس بھات پک رہا ہے۔ ہم لوگوں کو بھی ملے گا۔''
ابھیشیک نے خوش ہو کر اپنے باپ سے کہا۔

''چپ کر۔ پہلے معلوم تو کر لیں۔ بڑے کا گوس ہوا تب؟'' باپ نے بگڑ کر لڑکے کو ڈانٹا۔

''بڑے کا گوس مطلب؟''

''چپ رہے گا کہ دیں جھانپڑ۔'' باپ نے پھر سرزنش کی

''اس پر کاہے بگڑتے ہو۔'' پوتے کی حمایت میں جھنوا نے بیٹے کو ڈانٹا

کسی نے یہ پورا مکالمہ گوشت کی رعایت سے نمک مرچ لگا کر مالکن کے گوش گذار کر دیا وہ زور سے بگڑیں۔

''حرامزادوں کا دماغ تو دیکھو۔ اس جھنوا کا دادا مری کھاتا تھا۔ ہمارے بچپن میں گھر آیا کرتا تھا لیکن ہمیں اچھی طرح یاد ہے۔ بڑے کا تازہ گوشت تو نہایت شوق سے نعمت سمجھ کر لے جاتا تھا۔ عید میں ہماری دادی اس کے سر پر حصوں کا جھوا رکھوا دیتی تھیں۔ چلا جاتا تھا لپک جھپک گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ آبادی تب اتنی گھنی نہیں تھی۔ دس کوس کی مسافت طے کر کے لوٹتا تھا پھر اپنا حصہ اور تہواری لے کر ڈیوڑھی کی مٹی ماتھے سے لگا کر واپس ہو جاتا تھا۔ پچونی اور اس طرح کا انگرکھنگوا الگ باندھ لیتا۔''

اس کی زبان چلتی تو چلے ہی جاتی تھی۔

''بڑے ابا ہی نے سمجھایا تھا۔ ارے کم بخت مری تو مت کھایا کر۔ جانور اٹھاتا ہے تو کھال نکال لے۔ سریس کے لئے ہڈیاں بیچ لے لیکن مری کیوں کھاتا ہے۔''

''مالک بھر پیٹ گوس مل جاتا ہے۔'' پھر جلدی سے بولا ''ہم ترنت کا مرا جانور ہی کھاتے ہیں ہماری آنکھیں جانور پہچانتی ہیں۔ تھوڑی بھی باس آرہی ہو تو ہم نہیں کھاتے۔ یہ تو سیار کھوے ہیں جو کئی دن کی مری بھی اٹھالے جاتے ہیں۔''

''اب چپ ہو جا، بے ہودہ کہیں کا۔'' چھوٹے چچا کو ابکائی آگئی تھی۔

''اس ملک میں لوگ مری کھا رہے ہیں چوہے اور سیار کھا جاتے ہیں۔ ہم انہیں

حقارت سے مسہر اور سیار کھوا کہتے ہیں یا پھر اوع اوع کر کے رہ جاتے ہیں۔'' منجھلے چچا نے تاسف سے کہا۔

''تو کیا کریں ؟ ہم بھی کھانے لگیں ؟'' چھوٹے چچا کبھی کبھی گھر کے سخت ضابطوں کی خلاف ورزی کر کے بڑے بھائی کو جواب دے دیا کرتے تھے۔ بعد میں منجھلے چچا نے باقاعدہ سی پی آئی کی رکنیت اختیار کر لی تھی۔ وہ اور ان کے کئی دوست جن میں کچھ اعلیٰ ذات کے ہندو شامل تھے، دلتوں کے گھر بیٹھ کر چائے پیتے اور کیلے کے پتوں پر رکھ کر موٹی موٹی روٹیاں اور کدو کی بھاجی کھاتے۔ ویسے اس وقت دلت لفظ رائج نہیں ہوا تھا۔ گاندھی جی نے انہیں ہری جن کا لقب دیا تھا۔

دوپہر کو اماں کی طرف سے سب کو فی کس چار موٹی موٹی روٹیاں اور آدھی بھیلی گڑ دیا گیا۔ روٹیاں مادھو جی کی بیوی نے پکائی تھیں جو سب نے پرشاد کی طرح دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر لیں۔

''میٹھے سے روٹی کیسے کھائیں گے اس سے اچھا تو مالکن پیاز ہی دے دیتیں۔'' جھنوا کے بیٹے نے کہا جسے عام مزدوروں کے برعکس گڑ سخت ناپسند تھا۔

''گڑ روٹی بندھا ہوا ہے بچوا!'' جھنوا نے بیٹے سے کہا'' مجوروں کو اس ڈیوڑھی پر سدا یہی ملتا آیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب کیا بتائیں۔ بس دستور ہے۔ پرانے وقت سے گڑ روٹی ملتا چلا آیا ہے۔''

''دادا کے ٹیم سے؟''

''دادا کے بھی باپو کے ٹیم سے۔ تم کو یاد نہیں کیا؟ بہت دن سے مالکن نے مجوری کے لئے بلایا بھی نہیں تھا تم چھوٹے تھے تب ایک بار یہاں کام لگا تھا تب بھی یہی گڑ روٹی ملا تھا۔''

جھنوا کے بیٹے کا پہلا نوالہ منہ میں جاتے جاتے رک گیا وہ اس نے واپس ہاتھ میں پکڑی روٹیوں پر رکھ دیا۔ باپ کی طرف اس نے جن آنکھوں سے دیکھا ان میں شرارے تھے۔ تو وہ محنت کرتا پھر بھی مری کھاتا تھا اور سر پر بڑے کے گوشت کا جھوا لے کر

چلتا تو دس کوس کی مسافت پیدل طے کرتا چلا جاتا اور واپس آ کر ڈیوڑھی کی مٹی سر پر لیتا تھا۔ تو گڑ روٹی اس کی تاریخ تھی۔ ایسی تاریخ جس میں اس کے پردادا کو پیڑ سے باندھ کر جوتے مارے گئے تھے۔ اس تاریخ میں سر اٹھا کر چلنے جیسا کچھ نہیں تھا۔

جھنوا کے بیٹے نے سر اٹھایا اور چاروں روٹیاں اور ان پر رکھا گڑ خاک پر پٹخ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم کھا لو باپو، ہم جاتے ہیں۔''

اس بار اماں گاؤں سے واپس آئیں تو بڑے بھیا سے بڑے رسان سے بولیں ''ٹھیک ہی کہتے ہو تم لوگ۔ وہاں اب کچھ نہیں رہ گیا۔ زمین مکان کا جو فیصلہ چاہو کر لو۔''

# مرغے کی ایک ٹانگ

سارے گھر میں جیسے ہڑ کمپ مچا ہوا تھا۔ اوپر سے بھیا جی چاروں طرف گھوم گھوم کے بھنبھنا رہے تھے نہ جانے کتنی بار پاپا سے التجا کی تھی کہ نیچے کا مکان کرایے پر نہ لگائیں لیکن انہوں نے ایک نہیں سنی، اتنا بڑا لان تھا، پھول، پودے، مخملی گھاس کا فرش۔ کیا مزے سے نئے سال کی شام کو وہاں پارٹی ہوتی۔ سیخ کباب لگتے اور الاؤ جلا کر شعلوں کی سنہری روشنی میں نئے سال کا استقبال کیا جاتا۔

''ارے اوپر کھلی چھت تو ہے نا۔ یہ سب کچھ وہاں ہوسکتا ہے بلکہ ہو رہا ہے۔ پھر بھی شکل پہ بارہ بجا رکھے ہیں۔ بس اب بھنبھنانا بند۔ لو یہ پٹاخوں کے پیسے اور خوش خوش رہو۔ نئے سال کی شام کو غصہ نہیں کرتے۔'' ممانے محبت سے بھیا جی کے گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور انکی مٹھی میں کچھ کرارے نوٹ پکڑائے۔

''کیا صرف پارٹیوں کیلئے ہی لان چاہیے؟ جاڑوں میں مخملی دُوب پر چھاتہ لگا کر چائے پینے اور مما آپ کی سہیلیوں کے ساتھ گپ مارتے ہوئے نِٹنگ کرنے کے لئے کیسا اچھا ماحول بنتا۔'' بٹیا نے ناخنوں پر سے پرانی نیل پالش چھڑاتے چھڑاتے نظریں اٹھائیں۔

''ہاں بھائی میں تو صرف گپیں ہانکتی اور شغل کے طور پر سوئٹر بنتی ہوں۔ گھر سنبھالتے ہیں میرے ہمزاد ۔'' بھیا کو غصہ نہ ہونے کی نصیحت کرنے والی مما خود ناراض ہوگئیں اور غصے میں جمیلن کی طرف گھوم گئیں۔ ''اری او جمیلن۔ ایسی سست رفتاری سے کچھوے گھونگھے کی طرح رینگتی رہی تو ہو چکا کام۔''

بٹیا ہاہا کر کے ہنس پڑیں۔ ''مما، آپ کا سنس آف ہیومر''

''میں مذاق قطعی نہیں کر رہی۔'' مما اور زیادہ ناراض ہو گئیں۔ ''بالکل کچھوے کی طرح رینگ رہی ہے یہ جمیلن۔ ارے جھاڑن اٹھا اور تیزی کے ساتھ سارے شیشے پونچھ۔''

ذرا سی دیر میں جمیلن انسان سے کچھوا، گھونگھا، کیچوا سب کچھ بن چکی تھی۔ وہ شاید انسان کبھی تھی بھی نہیں، سڑی بسی، جھبری، بھوکی، ندیدی، ہمیشہ کچھ مانگتی سی آنکھیں۔ بھوک کے قلم سے لکھا گیا چہرہ۔

''جمیلن کچھوا کیسے ہو سکتی ہے۔ اسے تو کچھوی ہی کہا جا سکتا ہے۔ کچھوا تو مذکر ہے۔ ہے نہ جمیلن!''

جمیلن دانت نکوس کر مسکرائی۔ مذکر مونث تو اس کی سمجھ سے قطعی پرے تھا لیکن اسے بھیا جی بہت پسند تھے۔ وہ بڑی خوشدلی کے ساتھ اس سے باتیں کر لیتے تھے۔ گورے چٹے، بھرے بھرے گالوں والے پندرہ سالہ پرویز میاں جو عرف عام میں بھیا جی کہلاتے تھے، سارے گھر میں ناچتے کودتے، اودھم مچاتے گھومتے اور شام گہری ہو جانے کے بعد کتابوں میں سر گڑا کر بیٹھ جاتے۔ اتنا پڑھتے ہیں بھیا۔ اپنے پاپا کی طرح بڑے آدمی بنیں گے۔ ایک اس کا بیٹا ہے۔ بھیا سے کچھ ہی چھوٹا۔ سارا دن پھٹا بورا اٹھائے، دودھ کی خالی تھیلیاں اکٹھی کرتا پھرتا ہے۔ کچھ بولو تو کاٹ کھانے کو تیار۔ ماں کے وجود سے منکر۔ کیا مجال جو کبھی روپیہ دو روپیہ کما کر ماں کے ہاتھ پر رکھا ہو۔

گھوم پھر کر جمیلن پھر باورچی خانے میں آ گئی جو فضلو کی عملداری تھا اور جسے باورچی خانہ کہنے سے وہ بہت چڑتا تھا۔ یہ تجھے باورچی خانہ دکھتا ہے؟ صاحب لوگوں کا باورچی خانہ کچن کہلاتا ہے۔

چکّن؟

''رہے گی اُلو کی اُلو۔ ارے چکن تو مرغے کو کہتے ہیں۔ کچن بول، کچن!''

''نہ بابا۔ ہم سے نہ بولا جاتا چکّن کچّن۔ جہاں کھانا پکے وہ باورچی خانہ۔''

کھانے کے نام پر جمیلن کی آنکھوں میں چمک آ جایا کرتی تھی۔

”باورچی خانے میں لکڑیاں جلتی ہیں اور دھواں ہوتا ہے اور المونیم کے برتن لڑھکتے پھرتے ہیں۔“

فضلو ہار ماننے والا نہیں تھا۔

جمیلن نے جب پہلی بار یہاں قدم رکھے تو حیران ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے پورے گھر سے بڑا تھا یہ کمرہ جسے فضلو کچن کہنے پر مصر تھا۔ سفید پتھروں سے بنا ہوا بڑا سا چبوترہ۔ اس پر نہ جانے کیسی کیسی مشینیں۔ مشین میں مسالہ پسے، مشین میں کھانا پکے۔ سفید سفید چاول۔ خوشبودار، بھاپ چھوڑتے، گرم۔ سنہری دال، قاب میں گوشت اور سبزیاں۔ پیتل کے چم چم کرتے جال دار پیالے میں پھل۔ اتنا کھانا، ایک بار وہ بھی اپنے سامنے اتنا کھانا رکھ کر کھا سکتی اور دیکھتی کہ سامنے اتنا سارا کھانا رکھا ہو تو انسان کو لگتا کیسا ہے۔ یہاں میز پر سے کھانا بچ بچ کر آتا ہے۔ اس کے سامنے آئے تو کچھ نہ بچے۔ وہ اتنا کھائے گی، اتنا کھائے گی کہ بھوک پھر کبھی لگے گی ہی نہیں۔ بھوک جو لانبی نوکیلی گھاس کی طرح اس کے پیٹ میں ہمیشہ سرسر کرتی رہتی ہے۔ بھوک جو کانٹے دار درخت کی طرح معدے سے لیکر اس کی گندے اور گھنے بالوں سے ڈھکی کھوپڑی تک اُگی ہوئی ہے اور ہمیشہ گڑتی رہتی ہے۔

اری جمیلن یہ بال کیوں سادھوؤں کی جٹاؤں کی طرح کر رکھے ہیں۔ میم صاحب نے اسے صابن کا ایک ٹکڑا دیتے ہوئے کہا تھا۔ کل بال دھو کے آنا۔ پھر انہوں نے فضلو سے کہا تھا ارے فضلو یہ بال دھو کے آئے تو اسے ایک چلو کڑوا تیل دے دینا۔ سر میں ڈال کر کنگھی کر لے گی۔

”فضلو تیل آج ہی دے دے۔ اسنے فضلو سے کہا تھا۔ آلو کے چوکھے میں ڈال کے کھائیں گے۔“

نہ جانے کتنے دن سے اس نے اُبلے ہوئے آلو یونہی مسل کر کھائے تھے۔ اوپر سے ڈالنے کو چمچ بھر تیل بھی نہیں خریدا جا سکا تھا۔

جا۔ جا۔ تیل بھرتے میں ڈال کر کھا جائے گی اور بال بکھیر کر گھومے گی ہوڑن کہیں کی۔ پھر میم صاحب ڈانٹیں گی۔

جمیلن دل مسوس کے رہ گئی۔ لیکن جب میم صاحب نے اس سے اچار کا مرتبان چھت پر دھوپ میں رکھوایا تو اس نے ساڑی کی چنٹ کے ساتھ اڑسی چپٹی سی پلاسٹک کی ڈبیا نکالی جو اس نے گھر کی ردی کی ٹوکری میں پائی تھی۔ اس ڈبیا میں اس نے اچار کے اوپر آیا ہوا تھوڑا سا تیل نکالا اور ڈبیا بھر لی۔

سُوں سُوں سُوں کمینے فضلو نے ناک لمبی کر کے جمیلن کو سُونگھا۔ ''ارے جمیلن یہ آم کا اچار کہاں مہک رہا ہے۔ اچاری تو میم صاحب نے اوپر چھت پر رکھوائی ہے۔'' بڑا آیا میم صاحب کا سگا۔ پیٹ بھرا ہوا ہے اس لئے خیر خواہی دکھاتا ہے۔ اس دن جمیلن فضلو سے دُور دُور ہی رہی۔ گھر جا کر اس نے آلو مسل کر ان میں وہ تیل ڈالا تو بھرتے کا مزا ہی بدل گیا۔ سب بھرتے کا کٹورا اپنی طرف کھینچتے رہے۔ پھر ہمت کر کے ایک دن اس نے اچار کی تین چار پھانکیں چرائیں۔ چاولوں میں وہ اچار مل کے کھایا تو ایسی سرخوشی ایسی لذت کا احساس ہوا کہ کھانے کے فوراً بعد وہ خرخر کر کے گہری نیند سو گئی۔

جمیلن حال ہی میں اپنے دُور افتادہ گاؤں سے شہر آئی تھی جہاں اس کا شوہر رکشہ چلایا کرتا تھا۔ کچھ دنوں سے اس کی طاقت گھٹتی جا رہی تھی۔ ہر شام رکشہ بند کر دیتا تھا یا پھر صبح دیر تک سویا پڑا رہتا تھا۔ آمدنی بہت کم ہو گئی تھی اور مہنگائی اور بچے دونوں بڑھ گئے تھے۔ اس لئے اس نے سب کو شہر بلا لیا۔ بڑا لڑکا گھوم گھوم کر ردی کاغذ اور پولی تھین کی تھیلیاں چننے لگا۔ چھوٹے کو ایک چائے کی دکان پر گلاس دھونے اور بھٹی سلگانے کی نوکری مل گئی۔ جمیلن نے دو گھروں میں جھاڑو برتن کا کام پکڑ لیا پھر بھی گذر اوقات مشکل تھی۔ ایک بوڑھی ماں اور تین اور چھوٹے بچے کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ یہ چار موتہ مفت میں کھا رہے تھے۔

جمیلن کو ایک گھر سے ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ شہر میں جھاڑو برتن کرنے والی عورتوں کا ریٹ اس سے زیادہ تھا لیکن جمیلن تازہ وارد تھی۔ بے وقوف، کچھ ڈری ڈری سی اور ریٹ جیسے الفاظ سے نا آشنا۔ میم صاحب نے اس سے کہا تھا کہ کھانا اس کی تنخواہ میں شامل نہیں ہے۔ ہاں کبھی کچھ بچا ہوا یا تیج تہوار ہوا تو ۔ کھانا ہمارے نام کا کہیں نہیں ہے۔ جمیلن نے سوچا تھا اور ڈیڑھ سو روپیوں کو غنیمت جانا تھا۔ دوسرے گھروں سے ملنے

والی رقم اور شرائط بھی بالکل ایسی ہی تھیں۔ مالکنوں نے احسان بھی جتایا تھا کہ وہ اس جیسی ناتجربہ کار، گندی اور انجان عورت کو گھر میں رکھ رہی ہیں۔ جمیلن اس احسان کے بوجھ تلے دب گئی تھی۔ اس نے تین گھر پکڑ لئے تھے۔ علی الصبح نکل کھڑی ہوتی اور کوئی چار بجے واپس آتی۔

جمیلن آج یا تو رُک جا یا پھر گھر ہو کر سہ پہر تک دوبارہ آجا۔ مالکن کہہ رہی تھیں۔ آج ہمارے یہاں بہت سے مہمان آرہے ہیں کام زیادہ ہے۔ اکیلے فضلو سے نہیں سنبھلے گا۔ رُکے گی تو دوپہر کا کھانا یہیں مل جائے گا۔

کھانا—ان بڑے لوگوں کے گھر کا کھانا۔ خوشبوئیں لٹاتا، گرم بھاپ چھوڑتا۔ اکیلے بیٹھ کر ساس اور بچوں کی محاسبہ کرتی سخت گیر نظروں سے دور، آرام اور اطمینان سے بیٹھ کر بھر پیٹ کھانا۔ جمیلن جھٹ سے راضی ہوگئی۔ گھر میں بُڑھیا تھی ہی۔ بچوں کو دیکھ لے گی۔ شوہر نے بھی آج رکشہ دیر سے نکالا تھا اس لئے شام کو دیر سے گھر لوٹے گا۔ کوئی فکر نہیں تھی۔ پھرتی کے ساتھ کمر کس کے وہ کام میں جُٹ گئی۔

کھانے کے وقت فضلو نے اس کے لئے ایک بڑی پلیٹ میں چاول نکالے تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھنے لگی۔ سفید خوشبودار چاول، کنارے اچار کی ایک لانبی سی پھانک، کٹورا بھر دال، ایک چھوٹی طشتری میں آلو پالک۔ گوشت بھی پکا تھا لیکن وہ نہیں تھا۔ اسے ذرا سی مایوسی ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ان نعمتوں پر ٹوٹ پڑی جو اسے ملی تھیں۔ اس نے اتنی جلدی جلدی کھانا کھایا کہ وہ تھک کر ہانپنے لگی۔

''باپ رے یہ سُوکھی چمرخ جمیلن اتنا کھاتی ہے۔'' بھیا جی اسی وقت مٹھائی کے ڈبے ٹٹولتے ہوئے باورچی خانے میں آچکے تھے۔ ابھی ان کا بچپنا پوری طرح رخصت نہیں ہوا تھا۔ جو منہ میں آتا اطمینان سے بول دیتے۔ ایک لڈو منہ میں بھر کر انہوں نے شرارت سے جمیلن کی طرف دیکھا۔ ''اری جمیلن تُو تو قحط ڈال دے گی ہندوستان میں۔''

نہ کم سن بھیا جی کو معلوم تھا نہ جاہل جمیلن کو کہ ہندوستان جنت نشان قحط نہیں تو تقریباً قحط جیسی صورتِ حال سے اسی لئے بچا ہوا ہے کہ جمیلن کی قماش کے لاکھوں لوگ اتنا

نہیں کھا پاتے جتنا انہیں کھانا چاہیے۔

جمیلن شرم سے سمٹ گئی۔ ایک اضطراری حرکت کے طور پر اس نے پیٹھ موڑ لی اور رکابی پر میلی پھٹی ساڑی کے آنچل سے سایہ کر لیا جیسے وہ اس کھانے کو نظر بد سے بچا رہی ہو جو اسے یوں مل گیا تھا جیسے حضرت موسیٰ کے ہمراہیوں کو من و سلویٰ۔ اب رات کو کتنا من و سلویٰ بچے گا۔ کام کرتے کرتے جمیلن یہی سوچتی رہی۔ اس گھر میں ٹھنڈی مشین تھی اور سارا بچا ہوا کھانا اس میں رکھ دیا جاتا تھا کیا آج کا بچا ہوا کھانا بھی سمیٹ کر اسی میں تہیں رکھ دیا جائے گا؟ مگر، مالکن نے کہا تھا کہ رکنے پر وہ رات کا کھانا بھی دیں گی۔

سُوں سُوں سُوں۔ اسنے سانس لے کر خوشبوؤں کو اپنے پورے وجود میں سمونا چاہا۔ ایسی خوشبوئیں اس نے زندگی بھر نہیں سونگھی تھیں۔ کائی بھرے تالاب کی مہک، سڑی گھاس کی مہک، جنگلی پھولوں کی مہک، عجیب و غریب صورت کے پتوں والی بیلوں کی مہک جو اُلجھی جٹاؤں کی طرح اس کے گاؤں میں پھیلی رہتی تھیں۔ وہ بس انہیں سے آشنا تھی۔

شام کو مالکن نے اسے اپنی ایک پرانی ساڑی دی۔ ملائم کپڑے کی بھینی بھینی خوشبو والی ساڑی۔ ایک کنگھا بھی دیا۔ کپڑے بدل لو۔ ورنہ اس گندے حلئے میں لوگوں کے سامنے آؤ گی تو لوگ بھی کیا کہیں گے کہ مسز رحمٰن ملازمہ کو کیسے رکھتی ہیں اور سنو یہ ساڑی پہنے تمہیں دے دی۔ تمہاری ہو گئی ہے لیکن یہاں رکھ کے جانا۔ گھر لے جاؤ گی تو اس کا حلیہ بھی ویسی ہی زمین کی رنگت کر دو گی جیسا تمہارے اور کپڑوں کا ہے یا بیچ کے کھا جاؤ گی۔

آخری جملہ انہوں نے ذرا آہستہ سے کہا اور تیز تیز چلتی ہوئی دوسرے انتظامات میں مصروف ہو گئیں۔ جمیلن نے بال سنوارے اور ساڑی پہنی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا جسم بھی اس سبک ساڑی جیسا ہی ہلکا ہو گیا۔ بھینی بھینی خوشبو سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ گاؤں کے جنگل میں پہونچ گئی جہاں صبح کی ہوا میں کبھی کبھی ایسی ہی باس ہوا کرتی تھی۔ جنگلی پھولوں اور نئی کونپلوں کی۔ وہ روز ایسی ساڑی کیوں نہیں پہن سکتی۔ ٹھیک کہا تھا مالکن نے۔ اس کے ساتھ یہ ساڑی گھر چلی گئی تو ویسی ہی مٹی لوٹی ہو جائے گی جیسے اس کے اور کپڑے تھے۔

شام گہری ہونے پر اس نے اپنے نئے حلیے میں گرم شامی کبابوں کی قاب اٹھائی تو اسے ایسا لگا کہ یہ ساڑی پہن کر کوئی ایسا باعزت کام ہی کیا جا سکتا تھا۔ جھاڑو پونچھ نہیں۔ شرم سے اپنا دبلا پتلا جسم اور بھی چرا کر وہ کباب لے کر باہر آئی۔ وہاں لوگ بڑی تیز تیز گفتگو میں مصروف تھے۔ "شبانہ اعظمی نے نیلسن منڈیلا کو جو بوسہ دیا وہ لبوں پر ہرگز نہیں تھا۔ وہ کیمرہ ٹرک تھی یا نظر کا دھوکا۔ نیوز لائن قسم کے کسی کیسٹ میں وہ منظر مل جائے تو ذرا دوبارہ دیکھئے اور غور سے دیکھئے۔" "غور سے آپ دیکھئے حضور۔ بوسہ ہونٹوں پر ہو یا گالوں پر یہ تو سراسر غیر اسلامی حرکت ہے۔ آفٹر آل وہ ایک مسلمان عورت ہے اور پبلک فگر او پر سے۔ ایسی حرکتیں پوری قوم کو بدنام کرتی ہیں۔ صاحب اس کی فلموں کا بائکاٹ کیا جانا چاہئے۔"

"اماں چھوڑو یار کل تم نے تال کٹورہ ہوٹل میں گلاس اٹھا رکھا تھا اس میں خالص اسلامی شراب تھی؟"

"شبانہ اعظمی آپ کی خالہ لگتی ہیں یا چچی؟ مار طرف داری میں مرے جا رہے ہیں۔ ایک مرد کے کبھی کبھار بیئر سے شغل کر لینے اور ایک عورت کے سرِ محفل بوسہ بازی کرنے میں بڑا فرق ہے۔"

کمال کرتے ہیں آپ بوسہ بازی حد ہے بھئی۔ یہ لفظ یہاں کہاں فٹ ہو رہا ہے۔ آپ جیسے لوگ ہی ہندو فرقہ پرستوں کو مسالہ مہیا کرتے ہیں کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی تنگ نظری کو خوب

ارے بھائی شامی کباب لو گرما گرم۔ خاتونِ خانہ گھبرائیں کہ یہ کیا جھمیلا کھڑا ہو گیا۔ قبل اس کے بحث تلخ ہو جائے انہوں نے اسے ختم کرانے کی کوشش میں جمیلن کو جھڑکا۔ ارے کنارے کھڑی کباب کیوں ٹھنڈے کر رہی ہے۔ ادھر لے آ۔

کھانا اور کھانا یہاں سے وہاں تلک قابیں ہی قابیں۔ لوگ اٹھا اٹھا کر پلیٹیں بھر رہے تھے اور کھڑے ہو کر کھا رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے اور تیز تیز آوازوں میں گفتگو کر رہے تھے۔ وہ ساری گفتگو جمیلن کی سمجھ سے باہر تھی۔ ان کے الفاظ جمیلن تک کوئی معنی پہونچانے سے قاصر تھے جب سامنے اس قدر کھانا چنا ہوا ہو تو لوگ شاید ایسی ہی باتیں

کرتے ہیں۔ وہ حیران سی دوبارہ اپنی جائے پناہ یعنی باورچی خانے میں آ گئی۔

کھانے کے بعد اس نے جھوٹے برتن سمیٹے تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ زیادہ تر پلیٹوں میں کھانا بچا ہوا تھا۔ ایک پلیٹ میں مرغ کی سالم ٹانگ تھی۔ بالکل خشک اور الگ کو رکھی ہوئی۔ کئی پلیٹوں میں ثابت، ان چھوے شامی کباب تھے۔ کچھ میں بُھنے ہوئے گوشت کے پارچے۔ چاول تو بہت سی پلیٹوں میں تھے لیکن شوربے میں لتھڑے ہوئے۔ جمیلن نے مرغ کی ٹانگ، گوشت کی صاف بوٹیاں اور شامی کباب اٹھا کر پولی تھین کے ایک پیکٹ میں ڈال لئے۔ آخری کباب ڈال رہی تھی کہ فضلو کی نظر پڑ گئی۔ وہ کچھ کھسیانی سی ہو گئی۔ سُوکھی چیز۔ کنارے رکھی ہوئی۔ اس کو ہم جُھوٹا نہیں مانتے چچا۔ اس نے خود بخود وضاحت پیش کی۔ اسے معلوم تھا فضلو پلیٹوں میں بچا ہوا کھانا چُھوتا تک نہیں ہے۔

''ٹھیک تو ہے۔ تیرا دل قبول کرتا ہے تو لیجا۔ چاول سمیٹ کر الگ برتن میں ڈال دے۔ صبح جمادارن لیجائے گی۔'' کیوڑے اور گرم مصالحوں کی خوشبو میں لپٹے مٹر پلاؤ کی جھوٹن ایک بڑے سے تسلے میں ڈالتے ہوئے جمیلن کے دل میں مروڑ سی اٹھی۔ اتنا سارا پلاؤ جمادارن لیجائے گی۔ لیکن اس کا دل اس سَنی ہوئی جھوٹن کو لینے پر راضی نہیں ہوا۔

پھر مالکن نے اس کا کھانا نکال کر اسے دیا اور خاصی فراخ دلی کے ساتھ دیا۔ وہ کھانا دو لوگوں کے لئے بہت کافی تھا اور انہوں نے سبھی چیزیں دی تھیں۔ جمیلن کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ وہ جلد از جلد گھر پہونچنا چاہ رہی تھی۔ اس کی جھونپڑی بالکل پاس تھی پھر بھی مالکن نے فضلو سے کہا کہ وہ سے چھوڑ آئے رات زیادہ ہو گئی ہے۔

جھونپڑی کے دروازے پر آہٹ ہوتے ہی بُڑھیا نے للکارا۔ اب لوٹ رہی ہے مال زادی۔ اندر گئی تو شوہر نے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا مگر جمیلن کا چہرہ پھر بھی خوشی سے گلنار رہا۔ ابھی سب کا غصہ رفع ہو جائے گا۔ دیکھو کیا لائی ہوں۔ تھوڑی روٹی اور ڈال لوں تب سب مل کر کھائیں گے۔ پوٹلی سے سامان نکال کر اس نے المونیم کے تسلے میں رکھا تو بڑھیا کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ باچھوں سے رال ٹپکنے لگی۔ مٹی کی دیواروں کے ساتھ کھانے کی

خوشبو لپٹ گئی تھی۔ بڑھیا نے سرعت سے تسلہ اپنی طرف سرکایا ''ارے اماں۔ اکیلی تُو ہی کھائے گی کیا۔ لڑکوں کو تو کھانے دے۔'' جمیلن کے شوہر نے کہا۔

سب کھائیں گے۔ سب۔ جمیلن نے جلدی سے کہا۔ اس کی آواز میں دھار تھی۔ اکثر کھانے میں جمیلن مار کھاتی تھی۔ پہلے اس کا شوہر پھر ساس اور بچے۔ تب کہیں اس کی باری آتی تھی لیکن آج وہ اس ترتیب کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس نے جلدی سے تسلہ کھینچ کر خود پکڑ لیا۔ اتنا چاول سب کو کیسے پورا پڑے گا۔ ہاں سالن اور کباب بہت سے ہیں۔ میں تھک گئی ہوں۔ روٹی تُو ڈال لے اماں۔ آٹا ریحانہ مل دے گی۔ اس نے جلدی سے اپنی آٹھ سالہ بیٹی کو اٹھایا۔ جمیلن اب وہاں سے ہلنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ روٹی ڈالنے بیٹھی تو سارا کھانا لُٹ جائے گا اور اسے کچھ نہ ملے گا۔

''پلاؤ ہے؟'' اس کی ساس نے بے یقینی کے عالم میں کھسک کر چاول ٹٹولے۔ بھوک اس کے معدے سے اٹھ کر آنکھوں میں آ بیٹھی تھی۔

راہ دیکھتے دیکھتے اتنی رات ہوگئی۔ بوڑھی ہڈیوں میں بھوک برداشت کرنے کی طاقت نہیں رہ جاتی۔ ذرا سا پلاؤ کھالوں تو روٹی ڈالوں۔ بڑھیا نے تسلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ مرغ کا گوشت۔ وہ حیرت بھری مسرت سے چلائی۔ جمیلن نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ الگ کیا۔

''ارے تُو تو وہاں سے کھا کے آئی ہوگی۔ ایسے کیوں کر رہی ہے؟'' بڑھیا غرائی

ہم کھا کے نہیں آئے ہیں۔ کھانا لیا اور بھاگے۔ اس نے تسلہ اور کس کے پکڑ لیا۔

اب کی جمیلن کے شوہر نے جھٹک کر جمیلن کا ہاتھ الگ کیا۔ برتن اپنی تحویل میں لیا اور ایک شامی کباب اٹھا لیا۔ ''تُو روٹی ڈال۔ اماں سے نہ ہوگا۔'' اس نے بھرے ہوئے منہ سے جمیلن سے کہا۔

''ہمارا حصہ نکال کر الگ کر دو۔ تب ڈالیں گے روٹی۔'' جمیلن نے غصے سے کہا۔ اس کا دھان پان تھکا ہوا جسم روٹی پکانے کے نام پر صدائے احتجاج بلند کر رہا تھا۔

''اچھا لے۔ تیرا حصہ نکال دیتے ہیں۔'' اس کے شوہر نے المونیم کا کٹورا اٹھایا اور کچھ کھانا اس میں نکالا۔ جمیلن کمر پہ ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ہماری کمائی اور ہمیں اتنا

زرا سا؟"

"بڑا غراتی ہے کمائی پر۔ ابھی دو لات دیں گے، ساری کمائی دھری رہ جائے گی۔ ایسا ہی تھا تو وہیں ٹھونس لیا ہوتا سب۔ لائی کاہے کو یہاں؟"

"ارے یہ کھا کے آئی ہے۔ جھوٹ بولتی ہے۔ جھوٹی تو ایک نمبر کی ہے۔" بڑھیا نے کہا

اس درمیان سب بچے پلاؤ پر جٹ گئے تھے اور بڑے بڑے نوالے منہ میں ڈال رہے تھے۔

جاؤ جس کو کھانا ہے، روٹی خود ڈال لو۔ ہم سے نہ ہوگا۔ جمیلن نے اپنے حصے کے چاولوں اور ان پر پڑے ذرا سے شوربے ور ایک بوٹی کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور جھپٹ کر ایک مٹھی چاول اور اپنے پیالے میں ڈال لئے۔

بڑھیا نے لڑکوں کو ایک ہاتھ مارا۔ "شام کو سب نے پُوڑا کھایا تھا۔ پورا آدھا کلو تھا۔ پیٹ میں بھوت ہے کیا۔"

"ارے اماں۔ بھوت تو تمہارے پیٹ میں ہے۔ لڑکن کو کیا کہو ہو۔ اتنی عمر میں اتنا کھانا؟"

جمیلن کا شوہر پہلے ہی جلا بُھنا بیٹھا تھا۔ ایک طرف بیوی اپنی کمائی کا طعنہ دے رہی تھی دوسری طرف اماں اور لڑکوں نے کھانے کی لُنٹس مچا رکھی تھی۔ اس نے اٹھ کر جمیلن کو دو جھاپڑ رسید کئے۔

"اماں کو ایسے کہتی ہے حرام جادی۔ بہت اینٹھ رہی ہے۔ کل سے نوکری پر جانا بند کر دیا جائے گا۔"

جھگی کے پیچھے کھڑے پیپل کے درخت کے نیچے کٹورے میں تھوڑے سے چاول لئے کھاتی، آنسو پونچھتی، جھبرے بالوں والی جمیلن بالکل کوئی چڑیل لگ رہی تھی جو تفریح طبع کی خاطر پیپل سے نیچے اتر آئی ہو اور کسی راہ گیر کا کلیجہ نوش کر رہی ہو۔ دراصل کلیجہ تو خود اس

کا کوئی کھا رہا تھا۔ ایسی آگ لگی تھی اور جی ایسا دھڑ دھڑ جل رہا تھا کہ دو چار فائر بریگیڈ آجائیں تو بھی نہ بجھے۔

گئی رات تک وہ وہیں بیٹھی رہی۔ دل ہی دل میں اسی گھڑی کو کوس رہی تھی جب اس نے مالکن کے یہاں کھانا نہ کھا کر یہاں لانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دن میں اکیلے اکیلے اچھا کھانا کھایا تھا۔ دوسرے وقت پھر اکیلے کھانا اس کے گلے سے نہ اترتا۔ پھر وہ اتنا کھا بھی نہ پاتی۔ ہاں بھر پیٹ کھا لیتی اور جو بچتا وہ لے آتی تو ٹھیک تھا۔ ل بانٹ کے سارے کھا لیتے۔ مگر اب۔ وہ بھری ہوئی میز۔ بے شمار ڈونگے اور قابیں۔ پھولی ہوئی گرم گرم پوریاں۔ اس نے چھاتی پر دوہتڑ مارا۔ اس کا جی چاہا دوبارہ وہاں چلی جائے اور مالکن سے منت کر کے پیٹ بھر کھانا مانگے۔ بھوک آج بھی اس کے وجود میں تھوریوں کی طرح چُن چُن کر رہی تھی۔ اتنی محنت کے بعد بھی، اتنا کھانا لانے کے بعد بھی وہ بھوکی تھی۔ اب اس نے ٹپ ٹپ رونا شروع کر دیا۔

اماں نے سب کی نظروں تلے سے مرغ کی وہ تنومند ٹانگ صفا پار کر دی اور ایک روٹی بھی الگ کر لی۔ بعد میں روٹی میں لپیٹ کے وہ ٹانگ اس نے چھپر کے پھوس میں کھونس دی۔ جمیلن باہر جا کے بیٹھ گئی تو مجبوراً ریحانہ نے آٹا سانا اور چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ادھ کچری روٹیاں سینکیں۔ جھوٹن سے اٹھائی گئی بوٹیوں، شامی کبابوں اور کچھ مرغ کے پارچوں کے ساتھ چٹخارے لے لیکر سب نے کھانا کھایا اور گُڑی مڑی ہو کر گدڑی میں گھس گئے۔ ٹھنڈ برداشت سے باہر ہو گئی تو آنسو پونچھتی جمیلن بھی اندر آ گئی۔ اس وقت تک وہ سب خراٹے مارنے لگے تھے۔ خوں خوں۔ ''سالے حرامی۔ سارا کھانا کھا گئے۔ دیوزاد، بُھوت کی نسل۔ اب کی اگر کبھی مالکن کے یہاں کوئی دعوت ہوئی تو جو مل وہ وہیں کھا کے آئے گی۔ ان ڈکیتوں کو ہوا بھی نہ لگنے دے گی۔''

بڑھیا کو رات بھر چھپر میں کھونسی ہوئی مرغے کی ٹانگ خواب میں دکھائی دیتی رہی۔ صبح اٹھ کر وہ سب سے پہلے چھپر کے اس کونے کی طرف گئی۔ جہاں مالِ غنیمت چھپایا تھا اور بے چینی سے سب کے اِدھر اُدھر جانے کا انتظار کرنے لگی۔ پھر جمیلن کام پہ نکل گئی۔

دونوں بڑے لڑکے بھی چلے گئے اور چھوٹے لڑکے جھونپڑی سے ذرا ہٹ کر لگے کوڑے کے ڈھیر پر کھیلنے گئے تو بڑھیا نے اپنے بیٹے کی طرف پشت کی۔ اس نے ابھی تک رکشہ نہیں نکالا تھا اور گدڑی اوڑھے دروازے پر بیٹھا دھوپ کھا رہا تھا۔ مرغے کی ٹانگ نکال کر اسنے اسے دوپٹے میں چھپایا اور پُلیا کی طرف بڑھ گئی۔ پُلیا پر سناٹا تھا۔ وہاں بیٹھ کر اس نے وہ ٹانگ نکالی جو کھٹی کھٹی سی مہک رہی تھی۔ جنوری کی سردی کے باوجود چھپر کے پھوس کی گرماہٹ نے اس میں خمیر پیدا کر دیا تھ۔ مگر بڑھیا اطمینان سے مزے لے لے کر کھا گئی۔ ہڈی کو چبا کر بھوسہ کر دیا اور بہت دیر نشے میں بیٹھی دھوپ تاپتی رہی۔

گھنٹہ بھر بعد وہ گھر آئی تو جی کیسا کیسا ہو رہا تھا۔ طبیعت السائی ہوئی اور کچھ بھری بھری۔ جمیلن کام سے واپس آ چکی تھی اور روٹیاں سینک رہی تھی۔ ساتھ میں کچھ آم کا اچار لائی تھی جو فضلو نے اسے یہ کہہ کر دیا تھا کہ پیالے میں نکلا ہوا اچار اب واپس مرتبان میں نہیں جائے گا۔ اچار دیکھ کر بڑھیا کے منہ میں پانی آ گیا۔ دھیرے دھیرے وہ پھر کئی روٹیاں کھا گئی اور دوبارہ سو گئی اس مرتبہ اس کی آنکھ متلی کے شدید احساس کے ساتھ کھلی۔ کوئی اس کی آنتیں متھ رہا تھ۔ وہ تیزی کے ساتھ باہر نکلی اور جھگی کے باہر بیٹھ کر اوع اوع کرنا شروع کر دیا۔

شروع میں جمیلن جھنجھلائی۔ ساتھ ہی اسے ایک کمینی سی خوشی کا بھی احساس ہوا۔ رات بڑھیا نے اس کا حق مارا تھا اور خود کھا گئی تھی۔ پھر دن میں ٹھونس ٹھونس کر اس کی پکائی ہوئی روٹیاں اسی کے لائے ہوئے اچار کے ساتھ کھائی تھیں۔ ابھی ہاتھ پاؤں مضبوط تھے لیکن مجال نہیں کہ جمیلن کا ہاتھ بٹا دے۔ کام کو بوڑھی، کھانے کو جوان۔ اور کھاؤ بوڑھا! ہمارا حصہ کھاؤ۔

شام ہوتے ہوتے بڑھیا کو اٹھارہ بیس قے ہو چکی تھیں اور وہ نڈھال پڑی تھی۔ جمیلن کو فکر ہونے لگی۔ اس کے شوہر نے رکشہ آج بھی دیر سے نکالا تھا۔ اس لئے وہ واپس نہیں آیا تھا۔ جمیلن نے دوپٹے میں بندھی ریزگاری ٹٹولی۔ کل دس روپے آٹھ آنے تھے۔ اب اتنے میں جو بھی دوائی آ جائے۔ اس نے پُلیا پار رہنے والے ''ڈاکٹر صاحب'' کا دروازہ پیٹنا شروع کیا جو دراصل سرکاری ہسپتال میں کمپاؤنڈر تھے اور چوری کی دواؤں سے

غریب غربا کا علاج کیا کرتے تھے۔ ''بڑھیا اُلٹی کر کر کے ادھ مری ہوگئی ہے اب اتنے پیسوں میں جتنی دوائی آجائے دے دو۔'' اس نے دس روپے ان کی اٹنگی ٹانگ والی کرسی پر تقریباً پٹخ کر رکھے۔

بڑھیا کی حالت ڈاکٹر صاحب کی دوا سے قطعی نہیں سدھری۔ رات میں اسے دست بھی ہونے لگے۔ صبح ہوتے ہوتے وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئی اور بیٹا بہو کے سر پر ایک اور مصیبت لگ گئی۔ تجہیز و تکفین۔

گوشت کے پہاڑ، چاول کے ٹیلے، تھّی کے تھّی شامی کباب، مرغے کی ٹانگیں ہی ٹانگیں۔ کوئی نہ مرا اتنا کھا کے۔ میری بڑھیا اتنا سا کھا کے مرگئی۔ لڑتی تھی بلا سے۔ بچوں کو سمیت کے بیٹھی تو رہتی تھی۔ اطمینان سے بے کھٹکے ہم کام کر آتے تھے۔ ہم نے ہی کوسا تھا۔ شاید اس وقت کوئی بری گھڑی تھی۔ احساسِ جرم اور کفن دفن کی فکر میں غلطاں جمیلن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

☆☆

# دیول رانی کی کہانی

اس عورت کی پشت سے یہ قطعی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کبھی اسے دیکھا بھی تھا چہ جائیکہ تین برس پر محیط ایک بہت گہرا تعلق۔ دسمبر کی ٹھنڈ میں وہ ایک بھاری بھر کم کوٹ نما سوئیٹر پہنے ٹماٹروں کے ڈھیر پر جھکی اچھے ٹماٹر چھانٹ رہی تھی۔ کسی بھی عام گرہستن جیسی۔ غیر دل چسپ، غیر دل کش۔

''پانچ کلو چاہئیں۔'' اس نے سبزی والے سے کہا تو آواز بھی مانوس نہیں محسوس ہوئی۔ سردیوں کی شام کے گھنے کہرے میں لپٹی، شاید وہ اپنا مخصوص تاثر کھو بیٹھی تھی۔

پاس کھڑی ایک موٹی سی خاتون نے کہا ''چٹنی بنائیں گی؟''

''جی ہاں۔'' اس نے جھکے جھکے ہی جواب دیا۔

''گھر میں بہت سستی پڑتی ہے۔ بازار میں تو بہن جی آگ لگی ہوئی ہے۔'' موٹی عورت نے پھر کہا۔

وہ خاموشی سے ٹماٹر چھانٹتی رہی۔

موٹی عورت بے حد باتونی تھی 'جاڑوں میں بھنڈیاں! اب تو صاحب موسم سے کچھ مطلب ہی نہیں رہا۔ پہلے سبزی منڈی میں، ہری ہری، نازک مخروطی بھنڈیوں کا مطلب تھا گرمی کی آمد۔ یہ سارے امیروں کے چونچلے ہیں جاڑوں میں بھنڈی کھائیں گے اور گرمیوں میں مٹر ڈھونڈیں گے۔ سبزی تو وہی، مگر شان اس میں ہے کہ بے موسم کی کھائی جائے۔ ارے بھیئے ذرا پالک تولنا تو ایک کلو۔ میتھی ملا کے۔''

کامران دل ہی دل میں شرمندہ ہو گیا۔ وہ بھنڈیاں خرید رہا تھا۔ ساتھ میں چھوٹا ملازم لڑکا تھیلا لئے ہوئے تھا۔ یہ بھی امیروں کے چونچلے ہیں کہ سبزی کا تھیلا خود نہ اٹھائیں۔

اچانک جھکی ہوئی عورت سیدھی کھڑی ہو کر اس طرح مڑی کہ اس کا چہرہ کامران کے مقابل آ گیا۔ بھاری سویٹر کے باوجود اس کا چھریرہ جسم نمایاں ہوا تھا۔ وہ لانبے قد، ور کھلتی ہوئی گندمی رنگت کی عورت تھی۔ یہی کوئی تیس بتیس سال کی۔ اس کے بال چھوٹے تراشے ہوئے تھے اور بے حد گھنے تھے۔ سرخ یاقوتی ٹماٹروں اور سبز پتے دار سبزیوں سے بھرا تھیلا اس نے شانے سے لٹکایا اور غالباً کسی سواری کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس بار کامران کی بھرپور نظریں اس پر پڑیں اور وہ ہکا بکا رہ گیا۔ یہ تو نرگس تھی۔ نرگس یہاں؟ کوئی اور تو نہیں؟ لیکن اب تو اس نے ہر لڑکی کے چہرے میں نرگس کا چہرہ تلاش کرنا بند کر دیا تھا اس نے کنکھیوں سے دوسری بھرپور نظر اس پر ڈالی تو یہ نرگس ہی تھی۔ اس لئے کہ اس مرتبہ ان کی نظریں چار ہو گئی تھیں اور اس عورت کے چہرے پر بھی تحیر اور بے یقینی کا ویسا ہی تاثر پیدا ہوا تھا۔

''نرگس؟'' کامران اس کے قریب آ گیا ''اتنے زمانے بعد تم دہلی میں؟''

''اور تم..... کامران؟'' (نرگس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ یا کامران کو کچھ ایسا وہم ہوا تھا) ''کیسے ہو؟ دلی میں رہ رہے ہو کیا؟''

''زندہ، سلامت ہوں۔ اچھا بھی ہوں۔ دلی میں ہی رہ رہا ہوں۔ تم کیسی ہو؟''

کامران کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کے علاوہ اور کیا کہے کیا پوچھے۔

''میں بھی زندہ، سلامت ہوں۔ اچھی بھی ہوں۔ دلی میں ہی ہوں۔'' وہ تھیلے کے وزن سے ایک طرف کو جھک رہی تھی۔

کامران نے ملازم لڑکے سے کہا ''میڈم کا تھیلا اٹھا لو۔''

''مجھے اپنا بوجھ خود اٹھانے کی عادت ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''پٹ سے جواب دینے کی بھی تو عادت ہے۔'' کامران کو محسوس ہوا کہ نرگس کو دس برس بعد یوں دیکھ کر سن ہو جانے والی جو کیفیت پیدا ہوئی تھی وہ دور ہو رہی ہے۔

''وہ تو ہمیشہ سے تھی۔'' نرگس باقاعدہ ہنس پڑی۔ اس کے گالوں میں ننھے ننھے سے بھنور پڑے جو کامران کو بہت پیارے لگتے تھے۔ اس کی فطری دل کشی پوری طرح برقرار تھی۔ بس چہرے پر اور چہرے سے زیادہ گہری بھوری آنکھوں میں اداسی کا تاثر تھا۔ یا کیا پتہ وہ بھی کامران کا وہم ہو۔ شاید یہ سوچ کر اسے ایسا لگتا تھا کہ نرگس اس سے اچانک مل کر اداس ہو اٹھی ہے۔ اس کے بغیر وہ خوش نہیں رہی ہے۔

''اتنے سارے ٹماٹر کیوں خریدے؟'' کامران نے یہ سوال صرف اس لئے کیا کہ گفتگو جاری رہے۔

''کیا اتنے برس بعد مل کر ہم ٹماٹر کے فوائد پر گفتگو کریں گے؟''

کامران کھسیانا ہو گیا۔ یہ لڑکی ہمیشہ اسی کھسیاہٹ سے اسے دوچار کراتی رہی تھی۔ اتنے برسوں بعد بھی سچویشن کچھ خاص مختلف نہیں تھی۔

''سبزی منڈی میں کھڑے ہو کر اور گفتگو بھی کس موضوع پر کی جا سکتی ہے''

''کیوں، وہ سارے تاریخی کردار کہاں گئے؟ کیا تم نے بھی ان کی آخری رسوم ادا کردیں؟''

''تم بالکل نہیں بدلیں، نرگس!'' کامران کو یہ کہتے ہوئے تھوڑی سی مسرت کا بھی احساس ہوا۔

''بالکل بھی نہیں'' نرگس نے دل میں سوچا میں آج بھی تم سے پہلے جیسی وابستگی محسوس کر رہی ہوں۔ اگر تم اپنے کان قریب لاؤ تو میرے دل کی دھڑکنیں سن سکتے ہو۔ خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم میری زندگی کے افق پر دوبارہ طلوع ہو جاؤ گے۔ مگر دنیا بہت چھوٹی نکلی، کامران۔ اور میں یوں بھی نہیں بدلی کہ آج بھی میرے اندر اپنے جذبات کو چہرے تک آنے سے روکنے کی قوت اسی طرح برقرار ہے۔ میرا چہرہ پڑھنے کی اجازت کسی کو نہیں۔ تم کو بھی نہیں۔ اور اب ... اب تو ہرگز نہیں۔ لیکن اس نے کامران سے کہا ''بدلی کیسے نہیں؟ کیا دس سال پہلے بھی میں ایسی ہی نظر آتی تھی؟ اس طرح مجھے تو نوعمر لڑکی لگنا چاہئے تھا۔'' اس کی سوچ کا دھارا جاری رہا۔ ''وقت کسی کو معاف نہیں کیا کرتا۔ میں

جو تاریخ میں تمہاری دل چسپی سے چڑتی تھی، آج خود کو تاریخ میں ضم ہوتا محسوس کررہی ہوں۔"

"اور بھی کچھ بتاؤ نرگس لمبا چوڑا کنبہ معلوم ہوتا ہے تمہارا۔"

ماشاءاللہ بہت سمجھ دار ہیں آپ بغیر بتائے سمجھ گئے۔"

"تمہاری سبزیوں کا تھیلا بول رہا ہے۔"

وہ پھر ہنس پڑی۔ "تم بھی خالص کنبے والے بن گئے ہو۔ تھیلا اٹھوائے سبزیاں خریدتے گھوم رہے ہو اور گھوم پھر کر سبزیوں کی بات کررہے ہو۔"

"کامران نے خود کو اچھا خاصا احمق محسوس کیا۔ "ایسا کرتے ہیں نرگس، کہیں اور ملتے ہیں تاکہ ہم بحث کرنے کے علاوہ یہ جان سکیں کہ ان دس برسوں میں ہم نے کیا جھک ماری۔ زندگی سے ہم نے کیا پایا۔"

"بیوی سے ڈرتے نہ ہو تو پتہ دو۔ تمہارے گھر آجاؤں گی۔"

کامران مسکرایا۔ "نہیں، بیوی سے قطعی نہیں ڈرتا۔ لیکن میرا گھر اس لائق نہیں ہے کہ میں تمہیں بلاؤں۔ کچھ ایسا ہی سمجھ کر کہیں اور ملو۔"

"میں دوائیں بنانے والی ایک کمپنی کے ریسرچ ونگ میں کام کررہی ہوں۔" نرگس نے پرس سے کارڈ نکالا۔ "یہ پتہ ہے یہاں آجاؤ۔ بہت بڑا آفس ہے۔ ہماری اپنی کینٹین ہے۔ دو بجے میرا لنچ ہوتا ہے۔"

"میں یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہوں۔" کامران نے جواب دیا، کچھ اس طرح جیسے تاریخ پڑھانا جرم ہو۔

واقعی کچھ نہیں بدلتا۔ نرگس تاریخ کا اس قدر مذاق بنایا کرتی تھی کہ اس کے سامنے اپنے محبوب مضمون کی بات کرتے ہوئے وہ اچانک یوں چپ ہوجایا کرتا تھا جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔

وہ دونوں لکھنؤ یونیورسٹی میں ساتھ تھے۔ کامران ہسٹری فائنل میں تھا اور نرگس بائیوکیمسٹری سے بی ایس سی کررہی تھی اور پہلے سال میں تھی۔ دونوں کا ساتھ ہوا کرتا تھا بس اسٹاپ پر۔ حضرت گنج تک ان کی بس مشترک تھی۔ اس کے بعد نرگس دوسری بس پکڑ کر

اپنے گھر کے لئے روانہ ہو جاتی اور کامران کچھ دور پیدل چل کر اس لاج تک جاتا تھا جہاں اس نے ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ مضمون مختلف تھے، لیکن کلاس ختم ہونے کا وقت لگ بھگ ایک ہی تھا۔ اس لئے دونوں تقریباً روزانہ ہی یکجا ہو جاتے۔ نرگس خوب صورت نہیں کہی جا سکتی تھی، لیکن اس کا سراپا خاصا دل کش تھا۔ صاف اور بے داغ جلد، ستواں نقوش، گھنے بال جو کمر تک آتے تھے۔ لیکن کچھ دن بعد اس نے چھوٹے ترشوا لئے تھے۔

ان دونوں کے درمیان پہلا جملہ جسے بہت ذاتی اور شاید کسی حد تک رومانی کہا جا سکتا تھا، کامران کی زبان سے ادا ہوا تھا اور بالوں کے متعلق ہی تھا۔

''آپ کے بال اتنے حسین تھے، کٹوا کیوں دیئے؟'' اس نے بس اسٹاپ پر کہا تھا۔

''لانبے بالوں کی دیکھ بھال کے لئے وقت چاہئے۔ چھوٹے بالوں کو سنوارنے میں آسانی ہوتی ہے۔'' نرگس نے مختصر سا جواب دیا تھا اور وہ بھی سپاٹ انداز میں۔ کسی فلم کی ہیروئن کی طرح نہ شرما کر پلکیں جھپکائیں۔ نہ ہی ناراض ہوئی کہ بھلا کامران کو اس کے بالوں سے مطلب؟

''مجھے لانبے بال بہت اچھے لگتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے کامران کی زبان ذرا سی لڑکھڑائی تھی۔

''اچھا...'' نرگس نے ذرا دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا تھا پھر بولی تھی:
''تو بڑھا لیجئے۔ ایک اچھے ہیئر آئل کا نسخہ ہے میرے پاس۔ لا دوں؟'' پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

کامران ناراض ہو گیا تھا۔ ''میں لڑکیوں کی بات کر رہا تھا۔''

نرگس کے جواب دینے سے قبل بس آ گئی۔ دوسرے دن کامران نے نرگس سے پہلے جیسی بے تکلفی سے بات نہیں کی۔ بس ایک روٹھا روٹھا سا ''ہلو'' وہ بہت شرمندہ تھا۔ شاید اسے بے تکلف نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن پھر وہ یہ دیکھ کر ایک اندرونی خوشی سے سرشار ہو گیا کہ نرگس نے اس کی رکھائی کو محسوس کر لیا تھا، اور خود اس کے پاس آ کر اسے نارمل بنانے کی

کوشش کی تھی۔

''اکھڑے اکھڑے کیوں ہو؟'' نرگس نے کہا تھا۔''لڑ کر آ رہے ہو ڈیپارٹمنٹ میں کسی سے؟ وہ تمہارا مکرجی ہے ہی بڑا کھوسٹ۔ اس کی تو شکل دیکھ کر ہی کوئی اکھڑ جائے۔''

کامران بے اختیار ہنس پڑا۔ جھکی پروفیسر ڈاکٹر مکرجی کو سائنس فیکلٹی والے تک جانتے تھے۔

''اس کی درجہ بندی تم کس پیریڈ کے آثار قدیمہ کے تحت کرو گے؟'' نرگس نے انتہائی مسخرے پن سے کہا۔

وہ مسکراتا رہا۔ بولا کچھ نہیں

''میں بتاؤں ؟'' نرگس نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔''چنگیز خاں نے کبھی کچھ عمارت سازی کرائی تھی ؟''

''مونگ پھلیاں کھاؤ گی ؟'' کامران نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ کہیں اندر ہی اندر بے حد خوش ہوا تھا۔

''مونگ پھلیوں کا چنگیز خاں سے کیا تعلق ہے؟''

''وہی جو تمہارا مجھ سے ہے۔''

''یعنی انمل بے جوڑ۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ قسم کا۔''

پھر وہ دیر تک ہنستے رہے، مونگ، پھلیاں کھاتے اور گپ کرتے رہے۔ کامران نے دعا کی کہ بس دیر سے آئے یا اتنی بھری ہوئی ہو کہ انہیں جگہ ہی نہ ملے۔

وہ اس احساس سے کئی دن سرشار رہا کہ اس نے نرگس سے رکھائی برتی تو نرگس نے نہ صرف اسے محسوس کیا بلکہ صلح کی کوشش کی۔ طالب علمی کے زمانے کی وہ چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی خوب صورت مچھلیوں جیسی۔ آتی پھسلتی۔

ایک دن نرگس نے اس سے کہا۔'' کچھ اداکاری کا شوق ہے؟''

''کوئی خاص نہیں۔ کیوں؟'' کامران نے جواب دیا۔

''ویسے تو ہر وقت اداکاری کرتے رہتے ہو؟''

"کیا مطلب؟"

"میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ تم مجھے بڑی میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے رہتے ہو۔"

کامران بری طرح سٹپٹا گیا۔ "بہت بدتمیز ہو تم۔ لڑکیوں والی کوئی بات ہی نہیں تم میں۔" جھینپ مٹانے کو اس نے کہا۔

"آداب عرض ہے۔" نرگس نے ہاتھ اٹھا کر یوں آداب کیا جیسے کوئی شاعر کسی شعر کی داد پانے کے بعد کرے۔

کامران نے دیکھا' نرگس کا ہاتھ بہت خوب صورت ہے۔ لانبی مخروطی انگلیاں۔ بہت صاف گلابی ناخن۔ عام لڑکیوں کی طرح اس نے گدھ کے پنجوں جیسے ناخن بڑھا نہیں رکھے تھے۔ نہ ان پر نیل پالش کی تہیں تھوپی تھیں، پھر بھی وہ دل کش تھے۔ لیکن دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی پر وہ ایک انگوٹھی دیکھ کر بہت زور سے چونکا۔ اس سے پہلے تو اس نے یہ انگوٹھی نہیں دیکھی تھی۔

"یہ... یہ...... انگوٹھی۔" وہ جھنجلاہٹ بھول کر ہکلایا۔

"اب دیکھو، تم ہکلانے کی اداکاری کر رہے ہو اور کچھ کچھ حیرت زدہ ہونے کی بھی۔"

"نرگس... !" کامران نے دانت پیسے۔

"نرگس نے دانتوں تلے ہونٹ دبا کر اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر بولی۔ "کل منگنی تھی میری......"

"کیا واقعی؟"

"اگر تھی تو.....؟"

"مجھے اچھا تو نہیں لگے گا، لیکن میں خودکشی قطعی نہیں کروں گا۔ وہ زمانے لد گئے میاں مجنوں کے ساتھ۔"

"میں نے تو اتنی بھی امید نہیں کی تھی کہ تمہیں اچھا نہیں لگے گا۔ میں سمجھی تھی کہ اچھا لگے گا۔"

اس کٹھ حجت لڑکی سے بحث فضول ہے۔ جس طرح بات کر رہی ہے، اس سے

لگتا ہے کہ منگنی ونگنی قطعی نہیں ہوئی۔ بھاؤ بڑھا رہی ہے، کامران نے سوچا، پھر کہا۔ ''یہ ڈرامے والا کیا معاملہ ہے۔''

''میں یونیورسٹی کی تھیٹر آرٹس ورک شاپ کی ممبر بنی ہوں۔ ہم وگ ایک ڈرامہ لے کر دلی جائیں گے۔ اداکاری کر سکتے ہو تو ممبر بن جاؤ اور ساتھ چلو۔ اسی لئے پوچھا تھا۔ آیا عقل شریف میں؟''

''شوق ہے تو نہیں، پیدا کرنا پڑے گا۔'' کامران نے شرارت بھری نظروں سے نرگس کو گھورا۔ مگر واقعی کیا زمانہ آ گیا۔ جوان جہان لڑکیاں، بے نتھے بیل کی طرح چھوکروں کے ساتھ جہاں چاہیں چل دیں!''

''تمہاری ملاقات اپنی رشتے کی خالہ سے کرا دیتی ہوں جن کے ساتھ میں بطور پیئنگ گیسٹ رہتی ہوں۔ موصوفہ چالیس سالہ کنواری ہیں اور ان کے اور تمہارے خیالات میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ مل کر بہت خوش ہو گے۔''

اس کے بعد وہ دونوں بس اسٹاپ کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی ملنے لگے تھے کافی ہاؤس، شہید سمارک، دل کشا گارڈن، زو

''تمہیں پتہ ہے میری خالہ زو کو کیا کہتی ہیں؟'' ایک دن بندروں کو چنے کھلاتے ہوئے نرگس نے کہا۔

''مجھے کیسے پتہ ہو گا کہ تمہاری خالہ کس چیز کو کیا کہتی ہیں؟' کامران نے مسکرا کر جواب دیا۔ 'ابھی تک تو تم نے ملوایا نہیں۔''

''وہ زُو کو کہتی ہیں زندہ عجائب گھر۔''

''یار میں تو پوری دنیا کو زندہ عجائب گھر سمجھتا ہوں۔ اب دیکھلو یہ چلے جا رہے ہیں۔'' کامران نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو نہایت موٹا اور بے ہنگم تھا۔ دونوں بلاوجہ ہی ہی کر کے ہنسنے لگے۔ موٹے شخص نے انہیں پلٹ کر گھورا اور اپنی رفتار تیز کر دی۔

کامران تھیٹر آرٹس ورک شاپ کا ممبر بن گیا تھا اور ڈرامے میں اپنے رول پر بہت محنت کر رہا تھا۔ پھر وہ لوگ ڈراما فیسٹول میں شمولیت کے لئے اپنا ٹروپ لے کر دلی

چلے گئے۔ کئی مرتبہ فرصت کے اوقات میں گروپ سے کٹ کر ادھر ادھر گھوم آئے۔ پیسے دونوں کی جیب میں محدود تھے۔ کسی سستے ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی لینا، سڑک کے کنارے بھٹے اور پھلوں کی چاٹ کھانا تفریح کی معراج تھا۔ اور مسرت کی بھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ کی مسرت۔

مسجد قوت الاسلام کے پاس بیٹھ کر کامران نے مونگ پھلیوں سے بھرا رومال گھاس پر رکھا اور ایک مونگ پھلی کٹکتے ہوئے بولا "یہیں کہیں علاؤالدین خلجی دفن ہے۔ خلجی خاندان کا عظیم فرماں روا۔ اور اس کی قبر کی حتمی شناخت تک نہیں ہوسکی ہے۔ پتہ ہے نرگس، خلجی پیریڈ میں علاؤالدین نے ایک مضبوط سلطنت نہ قائم کر رکھی ہوتی تو منگولوں نے ہندوستان کو تاخت و تاراج کر دیا ہوتا۔"

"کیا فرق پڑتا؟" نرگس کو کامران کی تاریخی ہستیوں پر گفتگو کرنے کی عادت کی دھجیاں اڑانے میں بڑا مزا آتا تھا اس لئے اس نے بات کاٹ دی۔

"کیا فرق پڑتا...؟" کامران نے ہولے سے دہرایا۔ "کیا فرق پڑتا؟"

"ہاں، کیا فرق پڑتا اگر میری اور تمہاری آنکھیں ترچھی ہوتیں، ناکیں چپٹی اور رنگت زرد۔ ویسے اس کے باوجود بھی تم کچھ خاص خوب صورت نہیں ہو کہ دعویٰ کر سکوں کہ تمہارے خون میں منگول آمیزش نہیں ہے۔"

"اور ستم یہ ہے کہ لوگ آج اگر علاؤالدین خلجی کو یاد بھی کرتے ہیں تو ایک من گھڑت کہانی کے حوالے سے۔ جس کے مطابق اس نے چتوڑ کی رانی پدمنی پر بری نظر ڈالی تھی اور اس بیاہتا عورت کو حاصل کرنے کے لئے خون کے دریا بہادئے تھے۔ میں نے تو ایک تاریخ کے استاد کو یہاں تک کہتے سنا کہ وکرم شلا یونیورسٹی کو تاراج کرنے میں علاؤالدین کا ہاتھ تھا۔" کامران نے نرگس کی بکواس کو سراسر نظر انداز کرتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔

"یار کامران، یہ تمہارے منگول اولادیں تو خاصی چھوڑ گئے ہیں۔" نرگس کا لہجہ اس کی فطری شرارت سے پر تھا۔

''کیا مطلب......؟''

''میری مراد ان لوگوں سے ہے جو جھوٹی داستان طرازی اور گڑے مردے اکھاڑنے کے عمل سے فتنہ و فساد پھیلا رہے ہیں۔ اب تم جیسے چند سرپھروں کے علاوہ کس کو پڑی ہے کہ یہ تصدیق کرتا پھرے کہ پانچ سو برس پہلے درحقیقت کیا ہوا تھا۔''

''رانی پدمنی کی کہانی کی تصدیق کسی صحیح الدماغ مورخ نے نہیں کی۔ لیکن علاءالدین کے خاندان میں ایک بہت دل چسپ اور بہت ہی المیہ عشق کی تاریخی داستان موجود ہے۔ وہ ہے دیول رانی اور علاؤالدین کے بڑے بیٹے خضر خاں کی محبت کی داستان۔''

نرگس اب پوری طرح اکتا چکی تھی۔ ''کامران ہُر ددوں کی دنیا سے باہر نکلو گے یا میں دھکا دوں تمہیں؟''

''کبھی تو سنجیدگی سے وہ سب سن لیا کرو جو میں کہنا چاہتا ہوں۔''

''میں ان لوگوں کے بارے میں سنجیدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتی جن کی ہڈیاں بھی مٹی چاٹ چکی اور جن کی قبروں کے نشان تک باقی نہیں رہ گئے۔ دنیا بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ کل ہماری قبریں ہمارے بچوں تک کو نہیں ملیں گی۔''

''ٹھیک ہے تو آپ ان کے بارے میں سنجیدہ ہو جائیے جو آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ اس سے بھی پہلے اپنے بارے میں یہ بتائیے کہ بی ایس سی کے بعد کیا ارادہ ہے؟''

''میں شاید علی گڑھ چلی جاؤں۔''

کامران زور سے چونکا ''کیوں؟ یہ علی گڑھ کی کیا سوجھی؟''

''وہاں ایم ایس سی کے لئے وظیفہ ملنے کے امکانات ہیں۔ کامران میں اپنے والدین پر مزید تعلیم کا بار نہیں ڈالنا چاہتی۔ تمہارا کیا پروگرام ہے آگے کا؟ تمہارا تو ایم اے فائنل ہے۔''

''میں نے سوچا ہے کہ کوئی جز وقتی ملازمت کروں گا اور ساتھ ساتھ مقابلے کے امتحانات میں بیٹھتا رہوں گا''

''خیال برا نہیں ہے۔ لیکن کوئی متبادل لائن ضرور سامنے رکھنا۔''

"کیوں تمہارا خیال ہے میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا؟"

"کامیابی کی کسی نے گارنٹی نہیں لی۔ جو لوگ سیدھے بڑا افسر بننے کے خواب دیکھتے ہیں، ان میں ناکامی کا احساس بڑے خطرناک نتائج پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اپنا سر اپنے کاندھوں پر رکھو۔ ہم سائنس والوں کی طرح۔ ہم حقائق کی دنیا میں رہتے ہیں۔"

کامران کو نرگس کی بات کچھ بری لگی۔ "تاریخ کا ماسٹر بننے کی راہ میرے لئے ہمیشہ کھلی رہے گی۔" اس نے افسردگی سے جواب دیا اور نرگس سے جدا ہونے کے خیال سے مزید افسردہ ہو گیا۔

"نرگس کو اسکالرشپ مل گئی اور وہ علی گڑھ چلی گئی۔ کامران اپنی جدوجہد میں لگا رہا دو بار مقابلے کے امتحان میں بیٹھا اور دونوں بار ناکام رہا۔ وہ اپنے والدین سے شرمندہ تھا کہ چوبیس پچیس برس کا ہو کر بھی خود کفیل نہیں ہو سکا تھا۔ جز وقتی ملازمت بھی عارضی تھی۔ وہ ختم ہوئی تو اسے بھی ہار کر وطن جانا پڑا، جو ایک چھوٹا سا شہر تھا وہاں کے ایک پرائیوٹ اسکول میں اس نے تاریخ پڑھانا شروع کی۔ اس درمیان نرگس سے خط وکتابت ہوتی رہی تھی۔ لیکن گھر آنے کے بعد سے وہ خط وکتابت میں محتاط ہو گیا تھا۔ اس کے والدین پرانے خیالات کے تھے ان کے نزدیک کسی "غیر" لڑکے سے خط وکتابت کرنے والی لڑکی "شریف" کے زمرے میں نہیں آسکتی تھی۔ پھر اماں اپنی بھانجی سے کامران کی نسبت طے کرنے پر تلی ہوئی تھیں ویسے وہ گھر میں یہ کہہ تو سکتا تھا کہ اسے کوئی لڑکی اپنے لئے پسند ہے لیکن اس نے سوچا کہ کس منہ سے کہے۔ بایو کیمسٹری سے ایم ایس سی کرنے والی لڑکی کے لئے اچھی ملازمت پا لینا بہت آسان ہوگا۔ تعلیم کے دوران ہی اسے ایک معقول رقم وظیفے کی صورت میں مل رہی تھی۔ اور وہ خود کیا کر رہا تھا؟ ایک پرائیوٹ اسکول میں پانچ ہزار روپے ماہوار کی ماسٹری۔ دس سال پہلے اگرچہ ان روپیوں سے اس کا اپنا خرچہ نکل آتا تھا۔ لیکن اس رقم سے کنبہ چلانا . . پھر نرگس کیا اس چھوٹے سے شہر میں آکر رہنا پسند کرے گی جہاں اس کی وہ اعلیٰ ڈگری بے کار ہو جائے؟ ٹھیک کہا تھا اس نے کہ جو لوگ سیدھے بڑا افسر بننے کے خواب دیکھتے ہیں ناکامی ان پر بڑے خطرناک اثرات مرتب کرتی ہے۔ کامران اپنے خول

میں سمٹ چکا تھا۔ شاید خضر خاں کی طرح اس کی شادی بھی اس کی کزن سے کردی جائے گی۔ لیکن خضر خاں نے تو پھر دیول رانی سے بھی شادی کر لی تھی وہ کر سکتا ہے کیا؟ ایک شادی کی تو ہمت ہے نہیں۔ اور ویسے بھی دوسری شادی۔ لاحول ولا قوۃ! یوں تو یاروں کا خیال ہے کہ مسلمان چار شادیاں کر رہا ہے اور دھڑا دھڑ بچے پیدا کر رہا ہے۔ اسے پھر نرگس کی بات یاد آ گئی "یار کامران! یہ تمہارے منگول اولادیں تو بہت ساری چھوڑ گئے ہیں۔ نئے چنگیز اور ہلاکو اور الغ خاں اور کون کون۔۔۔" وہ مسکرانے لگا۔

خط و کتابت کا زور بہت دھیرے دھیرے کم ہوا۔ (ایسے ہی جیسے دھیرے دھیرے نرگس سے اس کا رشتہ مضبوط ہوا تھا) پھر ایک وقت ایسا آیا کہ خط و کتابت بند ہو گئی۔۔۔ نرگس لڑکی تھی۔ وہ نہ تو یہ کہہ سکی کہ کامران، تم میرا ہاتھ کیوں نہیں مانگتے اور نہ وہ چار چھ ماہ میں ایک بار آنے والے خطوں کے سہارے آئندہ کے لئے کوئی امید قائم کر سکی۔

کچھ روپے پس انداز کرنے کے بعد کامران دوبارہ لکھنؤ آیا۔ یہاں اس نے ہسٹری میں ریسرچ جوائن کی اور تھیسس مکمل کرنے کے بعد، جس میں تین سال لگ گئے تھے جدوجہد کے ایک نئے دور سے گذرا۔ آخر اسے دلی کالج میں لیکچرشپ مل گئی اور اس نے اطمینان کی سانس لی۔ لیکن نرگس کا اب کہیں پتہ نہ تھا۔ کافی دن تنہائی جھیلنے کے بعد اس نے سوچا کہ اماں کو لکھ دینا چاہئے کہ وہ خاندان میں پائی جانے والی لڑکیوں کی بھیڑ میں سے کوئی ایک اس کے لئے منتخب کر لیں۔ وہ پرانے زمانے اب نہیں ہیں کہ گریبان چاک کر کے نرگس، نرگس الاپتا ہوا گلی کوچوں میں گھومتا پھرے۔ حقائق کی دنیا میں رہنے والی سائنس کی اس ذہین اسکالر نے بھی اب تک گھر بسا کر چھٹی کی ہوگی۔

اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ نرگس اسے کیوں دکھائی دے گئی۔ وہ تاریخ بن چکی تھی۔ اسے دھندلکے میں ہی رہنا چاہئے تھا کیوں مل گئی وہ طوفان اٹھانے کو؟ کیا اس سے ملنا مناسب ہوگا؟ کیا اس سے ملنے کے بعد وہ اپنے اوپر قابو رکھ سکے گا؟ وہ پکی گرہستن بن چکی ہے۔ کیا اس کی دنیا میں بھی ایسی ہی ہلچل نہیں مچ جائے گی؟ مگر اس نے پتہ دیا ہے وہ اس کا انتظار کرے گی۔ ایک بار، بس ایک بار ضرور مل لینا چاہئے۔

کامران دوسرے ہی دن نرگس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی فطری سادگی آج بھی چہرے پر یوں ہی برقرار تھی۔ نرگس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ اس نے یہ سوچنے کی کوشش کی کہ کامران قطعی اچھا نہیں لگ رہا ہے اس کے چہرے پر اس کے باطن کی سادگی نہیں، کسی ایسے شادی شدہ شخص کی حماقت ہے جو ایک دوسری عورت سے ملنے آیا ہے اور نرگس کو جس طرح تاریخ میں دل چسپی نہیں تھی اسی طرح دوسری عورت، بننے میں بھی قطعی کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ دل پر ایک بار ہی پتھر رکھنا پڑے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قوت ارادی جواب دے جائے۔ اس نے کئی ایسی عورتوں کا حشر دیکھا تھا جو شادی شدہ مردوں کے چکر میں پڑ کر تباہ ہو رہی تھیں۔

وہ کامران کو ساتھ لے کر کینٹین چلی آئی۔ دونوں بہت دیر تک خاموش بیٹھے چائے کی پیالیوں میں شکر ملاتے رہے۔ پھر نرگس نے ہی خاموشی توڑی۔ کامران!''

''ہوں ''

''یہ ملاقات ضروری تھی۔'' نرگس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''اس لئے تم سے یہ کہہ سکوں کہ ہمارا ایک دوسرے سے ملنا، ربط ضبط رکھنا، قطعی مناسب نہیں ہے۔ یہ ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ اس لئے آئندہ ہم نہیں ملیں گے۔''

''سمجھتا ہوں تمہارے شوہر ''

''نہیں۔ تمہارا کنبہ تمہاری بیوی، تمہارے بچے ''

''میری کوئی بیوی نہیں ہے۔ میں نے اتنی جدوجہد کی، اتنے پاپڑ بیلے کہ شادی کی سوچ بھی نہیں سکا۔ اور پھر نرگس، شاید میں اپنے زخم چاٹ کر ان کے بھرنے کا انتظار بھی کر رہا تھا۔ وہ زخم جو آج پھر ہرے ہو گئے ہیں ''

''کامران!'' نرگس نے آنکھیں اٹھائیں، جو حیرت، طمانیت اور آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ''میرا کوئی شوہر نہیں ہے، کامران۔!'' پھر آنسوؤں کے درمیان مسکرا کر بولی: ''مجھے دیول رانی کی کہانی سناؤ گے؟''

☆☆

# شناخت

بُوا سائیں نے پیتل کی بالٹی دونوں گھٹنوں سے بیچ دبائی اور قرأت کے ساتھ بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر بکری کا دودھ دوہنا شروع کیا۔ شرر شرر بھرپور دھار بالٹی سے ٹکرائی اور دیکھتے ہی دیکھتے بالٹی بھرنے لگی۔ چھلکتی بالٹی لے کر وہ خوشی خوشی اوسارے تک آئے۔ آگے لکشمن ریکھا تھی۔

بُوا سائیں کے اندر اللہ میاں کی فٹ کی ہوئی گھڑی لگی ہوئی تھی۔ کیا مجال جو وقت کا اندازہ غلط ہو جائے۔ بڑی پنڈتائین نہا کے پوجا ختم کر چکی ہوں گی۔ منجھلی تو کب کی تلسی کو جل چڑھا کے رسوئی گھر میں آ چکی ہوں گی۔ ناشتے کی نگرانی انہیں کے ذمے تھی۔ چھوٹی ان کی مدد کیا کرتی تھیں لیکن آج کل وہ مائکے گئی ہوئی تھیں۔

بُوا سائیں نے کہارن کو پکارا ''اری کل بتیا دودھ لے جا آ کے''۔ پھر انہوں نے مسرور لہجے اور بلند آواز میں اعلان کیا: ''آج تو کمال ہو گیا۔ بکری نے پوری بالٹی بھر کے دودھ دیا ہے۔ کل نظر اتاری تھی نہ۔'' انہیں معلوم تھا ان کی آواز اوسارے کے بعد بڑا سا آنگن پار کر کے رسوئی میں پنڈتائن کے کانوں تک پہونچ گئی ہوگی۔ وہ گاؤں کی مسجد کے موذن تھے۔ پانچوں وقت کھیت کھلیان پار کرتی چھٹ پٹ پھیلے ہیں پچیس مسلمان گھروں تک ان کی آواز یونہیں ہوا کے دوش پر تیرتی پہونچ جایا کرتی تھی۔ بامنوں کا گھر کتنا ہی بڑا ہو یہ اوسارے سے رسوئی کا فاصلہ تو کوئی چیز ہی نہیں تھا۔

''نظر لگنے والی بات سب سے پہلے ہم نے کہی تھی۔ رسوئی میں کھڑ بڑ کرتے،

توند سنبھالتے موٹے رسوئیے نے فخر سے کہا اور بڑے بھیا کی تھالی میں خوب سنکا ہوا لال کرکرا، گوبھی کا پراٹھا ڈال کر بھرواں مرچ کے اچار کی کٹوری بھی بڑھا دی۔ تینوں بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ ماتھے تک گھونگھٹ کھینچ کر پنڈتائن جھپا جھپ پراٹھے اتار رہی تھیں رسویا لوئی بھر کر انہیں دیتا جاتا تھا۔ بڑی سی پرات میں کدوکش کی ہوئی، مسالہ ملی گوبھی اس کے سامنے رکھی تھی۔ وہ ہاتھ سے بھراون سمیٹ کر اندازہ لگا رہا تھا کہ اور گوبھی کدوکش کرنی پڑے گی یا کام چل جائے گا۔ چولہے کے دونوں 'موہنوں' پر توے چڑھے ہوئے تھے۔

''ہاں کہی تو تھی مگر نجر اتاری تو بڑبا سائیں نے نہ'' کلاوتی نے بالٹی رکھتے ہوئے کہا۔ موٹے رسوئیے کی ہر بات کاٹنا اس نے اپنا اولین فریضہ قرار دے رکھا تھا۔

''دوسری بالٹی دے آ، کالی کا بھی دودھ نکال لے گا بڑبا، سائیں۔'' پنڈتائن نے پراٹھے پر چمچ بھر گھر کا دانے دار گھی ڈالتے ہوئے کلاوتی کو حکم دیا اور رسان سے بولیں ''اب نظر تو بڑبا سائیں ہی اتارتے ہیں۔ آدمی کو لگے کہ کیا بھینسی کو۔''

''ملکائن۔ کالی کا دودھ تو ہم ابال بھی چکے'' رسوئیے نے کہا۔ ''پہلی بالٹی اسی کی تھی۔'' بالٹی کی طرح اس کا لہجہ بھی چھلکا چھلکا سا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ بڑبا سائیں سے کہو، ذرا بیٹھیں۔ ناشتے میں آج کچھ دیر ہوگی۔''

پیغام ملنے پر ان کا جواب پھر ہوا پر تیرتا ہوا ہی آیا۔ ''ہم جا رہے ہیں۔ ملکائن۔ گھر پر ہی کھا لیں گے۔ اب یہاں کھایا یا وہاں۔ آج ہمیں بھی دیر ہو رہی ہے۔ وہ قدرے ہچکچاتی چال کے ساتھ باہر نکلنے کو ہوئے۔

''بڑبا سائیں، بڑبا سائیں'' آواز میں لجاجت تھی ''نکل مت جائیے گا۔ ناشتہ بڑی چاچی بھجوا رہی ہیں۔ ہمارے ساتھ ڈنڈ بیٹھک لگانا ہے۔'' گھر کے بچوں میں سب سے چھوٹے لڑکے نے جو نہا کر ابھی باہر نکلا تھا رسوئی کی طرف جاتے ہوئے پکار کر کہا۔ گیارہ سالہ شیام نارائن اپادھیائے کو پہلوانی کا شوق چرایا تھا۔ بڑبا سائیں کبھی گاؤں کے اکھاڑے میں ڈنڈ بیٹھک لگایا کرتے تھے اور سینکیا پہلوان کے نام سے جاتے جاتے تھے لیکن شیام نارائن کے لئے بڑے پنڈت جی یعنی ان کے دادا نے جو عرف عام میں دڈو

کہلاتے تھے مناسب سمجھا تھا کہ بوبا سائیں ان کی ورزش کی نگرانی کریں۔ شیام نارائن کو اکیلے تو کیا چچیرے بھائیوں یا آس پاس کے لڑکوں کے ساتھ جانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔

ساما بھیا بُوبا سائیں کے بڑے چہیتے تھے۔ وہ کچھ کہہ دیں اور بُوبا سائیں نہ مانیں۔ اس لئے سائیں پلٹ آئے۔ کچھ دیر بعد ان کا ناشتہ بھی آ گیا۔ ان کے ناشتے کے برتن الگ تھے۔ المونیم کی تھالی کٹوری اور چائے کے لئے تام چینی کا بڑا سا مگ جو تاملوٹ کہلاتا تھا۔

برتن بھلے ہی الگ ہوں لیکن ناشتہ وہی ہوتا تھا جو سب کھاتے تھے۔ اس لئے اس وقت بھی موٹے موٹے سرخ، کرکرے، گھر کے دانے دار گھی میں تلے گوبھی کے پراٹھے بھروان مرچ کا اچار اور تاموٹ میں خوب میٹھی، بہت سارا اونٹا ہوا دودھ ڈال کر بنائی ہوئی گرما گرم چائے ان کے سامنے لا کر رکھ دے گئے "اے بھیا۔ دیر مت کیجئے گا۔ پھٹا پھٹ آ جائیے" ناشتہ کر کے کنویں سے ذرا ہٹ کر اپنے برتن مانجھتے ہوئے بُوبا سائیں نے پکار کر کہا۔" دن چھوٹا ہونے لگا ہے۔ ظہر کی اذان کا وقت جلدی ہو جاتا ہے کئی کام نمٹانے ہیں، بیچ میں"

بُوبا سائیں کی زندگی بڑے بندھے ٹکے ڈھرے پر چلتی رہتی تھی۔ فجر کی اذان دیتے پھر نماز پڑھ کر وہ تھوڑی دیر لیٹ رہتے۔ اس عرصے میں ان کی نیک اور کم سخن بی بی جن کا نام حور بانو تھا ان کے لئے شیشے کے ایک پرانے سے گلاس میں گڑ کی کالی چائے لا کر رکھ دیتیں۔ (بساطی سے بھٹے کی تازہ بالوں کے بدلے لیا گیا یہ گلاس ان کے سگھڑاپے کا مظہر تھا اس لئے کہ کئی برس کے روزانہ استعمال کے بعد بھی ٹوٹا نہیں تھا) بُوبا سائیں کہتے تھے کہ انہیں مرنے سے پہلے اسی زندگی میں حور مل گئی ہے اس لئے آخرت میں ان کے امکانات محدود ہو گئے ہیں شاید اسی لئے وہ اذان دینے کی ڈیوٹی تو نہایت چوکسی کے ساتھ بجاتے کہ یہ فریضہ ان کے مرحوم والد نے ان کے کندھوں پر ڈالا تھا لیکن فجر کی نماز کے علاوہ باقی نمازیں چھوڑ کر بھاگ لیا کرتے تھے۔ ویسے ان کی نماز چھوڑ کر بھاگنے کی عادت بہت

پرانی تھی۔

گاؤں کی مسجد کے اس وقت کے امام صاحب نے سائیں برادری کے لڑکوں کو تعلیم دینے کا بیڑا اٹھایا تھا کہ کم از کم یہ نسل بھیک مانگنے کا پیشہ چھوڑ کر کچھ کرنے لگے ورنہ حال یہ تھا کہ بڑ با سائیں کے والد دلدار سائیں کو اپادھیائے کے بڑے بزرگوں نے پانچ بیگہہ زمین دے کر اس پر بسایا تھا پھر بھی وہ گھوڑی پر بیٹھ کر بھیک مانگنے نکلا کرتے تھے کہ یہ ان کا آبائی پیشہ تھا۔ دلدار سائیں کے اندر ایک خداداد صلاحیت تھی۔ وہ دودھارو جانوروں کی ہر قسم کی بیماری کا علاج کر لیا کرتے تھے اس وقت گاؤں کیا، قصبے میں بھی ویٹنری ڈاکٹر نہیں تھا۔ زیادہ پریشان ہو تو جنور کو شہر لے جانا پڑتا تھا۔ برہمنوں کی پوری گوشالہ تھی۔ بڑ با سائیں کے والد گئیوں کی جھاڑ پھونک بھی کرتے تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا اسی لئے اپادھیاؤں کے یہاں دودھ کے دریا بہتے ہیں اور گھی کھا کھا کے لڑکے گھی کی طرح سفید اور چکنے ہیں۔ لاّ سب سے چھوٹے بیٹے کے اکلوتے لڑکے شیام نارائن کے۔

دلدار سائیں نے بڑے پنڈت جی کے زور دینے پر اور خود بھی کچھ سوچ کر محبوب محمد سائیں کو مولوی صاحب کے حوالے کر دیا جہاں کوئی پانچ سات لڑکے ٹاٹ پر بیٹھ کر قرآن حدیث اور کچھ اردو سیکھتے۔ لیکن محبوب سائیں کہہ کے تو نکلتے کے مدرسے جا رہے ہیں لیکن اکثر و بیشتر غائب ہو جاتے اور گاؤں کے حاشیے پر رہنے والے چماروں کے لونڈوں کے ساتھ امرائیوں میں کنچے کھیلتے۔ کئی مرتبہ دلدار سائیں ان کے ہاتھ باندھ کر گھسیٹ کر لائے اور مولوی صاحب کے پاس چھوڑ گئے۔

ایک مرتبہ تو ایک واقعہ بھی ہو گیا۔

دلدار سائیں صاحبزادے کے ہاتھ باندھ کر رسی گھسیٹے چلے آ رہے تھے کہ راستے میں ایک نہایت پھٹے حال فقیر دکھائی دیا۔ محبوب سائیں بولے ابا ہمیں بڑا ترس آ رہا ہے۔ ہماری جیب میں ایک ادھنا ہے اسے دیدیں؟

"اب ذات کا سائیں تو بھیک لے گا کہ دے گا؟ اچھا چل نیکی دل میں آئی ہے تو دے دے۔"

"تو ابا ہاتھ کھولو گے تب نا"۔ محبوب سائیں نے منمنا کر کہا۔

ابا نے رسی کھول دی محبوب محمد بھاگے بگٹٹ، کہاں کی اکنی اور کیسا ادھنا اور کون سا فقیر دو دن تک گھر نہیں آئے کہ ابا کا غصہ ٹھنڈا ہولے تو چلیں۔ ادھر ابا ان دو دنوں میں اچھی طرح ابل چکے تھے۔ گھر سے نکلے تک نہیں کہ کہیں لونڈا چپکے سے آ کے ان کے ہاتھ کی پکی کھا کے، روپیہ آٹھ آنہ موس کے نکل نہ لے۔ تیسری شب چپکے سے محبوب محمد عرف بوبا سائیں گھر میں داخل ہوئے تو نہ جانے کون سا موکل ابا کے قبضے میں تھا کہ انہیں خبر ہوگئی۔ وہ جوتہ کاری کی بیٹے کی کہ آج تک وہ ہنس کر یاد کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس دن پٹائی نہ ہوئی ہوتی تو آج بوبا سائیں نپٹ جاہل ہی ہوتے اور وہ عزت نہ ہوتی جو آج مل رہی ہے۔ آج ہم اذان دیتے ہیں امام صاحب بیمار پڑ جائیں تو نماز بھی پڑھا دیتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ برہمن خاندان نے ہمیں بالٹی تھما دی ہے ہم ان کے یہاں دودھ نکالتے ہیں ورنہ مسلمان مویشی چرانے لے ضرور جاتے تھے ان سے دودھ نہیں نکلوایا جاتا تھا۔ دلدار سائیں بیٹے کو جانوروں کے علاج اور جھاڑ پھونک کا اضافی علم بھی دے گئے تھے۔ پھر بھی ابا کو یہ ملال رہ گیا کہ محبوب محمد سائیں نے ان کے خواب آدھے ادھورے ہی پورے کئے تھے۔ وہ انہیں باقاعدہ مولوی اور حافظ بنانا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ تربیت کے لئے مولوی صاحب نے امامت ان کے سپرد کی تھی۔ ادھر نمازی سجدے میں گئے ادھر بوبا سائیں درمیان سے غائب ہوگئے۔ اتنا لمبا سجدہ۔ ایک نمازی نے ذرا سر اٹھانے کی ہمت کی تو دیکھا امام صاحب غائب ہیں۔ ہلچل مچ گئی۔ اس بار پھر چار چوٹ کی مار پڑی تھی لیکن دلدار سائیں کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ نالائق بیٹا پانچ سات سپارے حفظ کرنے اور اردو میں خط و کتابت کر لینے سے آگے نہیں بڑھ پائے گا۔ چلو اتنا بھی کون تھا برادری میں پورا قرآن حفظ نہ سہی ختم تو کیا تھا۔ اور قرأت کے ساتھ۔ کئی مسئلے مسائل کا حل بھی بیان کر لیتے تھے۔ دعا اور دوا دارو سب یاد تھے۔ دودھارو جانوروں کے علاج کے لئے ویسے تو جڑی بوٹیاں استعمال کرتے تھے لیکن جھاڑ پھونک گنڈا، تعویذ بھی خوب کر لیا کرتے تھے۔ ادھر کچھ دنوں سے ڈھور ڈنگر کے علاوہ سامابھیا کی نگرانی بھی ان کے سپرد کردی گئی تھی۔

ہوا یوں کہ ایک دن اکھاڑے سے خبر آئی کہ لڑکوں میں جھگڑا ہوگیا ہے، اس وقت سامنے بُوبا سائیں بھی موجود تھے۔ دڈو نے انہیں کو روانہ کیا کہ جا کے گھر کے لونڈوں کو پکڑ لائیں۔ اپنے گھر کے تین اور ساما بھیا کو گنا جائے تو ساڑھے تین لڑکے ملوث تھے۔ اکھاڑے میں خاصی مار پیٹ ہوگئی تھی۔ گاؤں کے کنارے رہنے والے کچھ ہریجنوں کو اکسا کر پٹی داروں نے بھیجا تھا۔ پٹی داروں کے ساتھ زور کرنے کے لئے ویسے بھی بڑے مالک نے منع کیا تھا چہ جائیکہ تاڑی اتارنے والے پاسیوں سے ربط ضبط۔ تینوں بڑے پوتوں کو بڑے مالک نے پیٹ پاٹ کے درست کردیا جو ویسے بھی مار کھا کے آئے تھے کہ اقلیت میں تھے۔ اب ''ایڈمنسٹریشن'' نے الگ دھنائی کی۔ پندرہ سولہ سال کے مسیں بھیگتے نوجوان لڑکے سر جھکا کے دڈو کی مار چپ چاپ یوں جھیل گئے جیسے گھنے درخت کے نیچے کھڑے ہوں اور اوپر سے پھول گر رہے ہوں ٹپاٹپ، ٹپاٹپ۔ ساما بھیا کو صرف ڈانٹ کر چھوڑ دیا گیا۔ (گرچہ ڈانٹ ایسی تھی کہ ان کا پیشاب خطا ہوتے ہوتے بچا) بعد میں چچازاد بھائیوں نے شکایت کی کہ دڈو صرف ہمیں کو مارتے ہیں ساما کو ایک تھپڑ تک نہیں پڑا۔ شکایت بوبا سائیں کے سامنے اس انداز سے کی گئی کہ وہ بڑے مالک تک اسے پہونچادیں۔

دڈو کے پاس سیڑھی پر بیٹھ کر گپ کرتے وقت کھیتوں کی سنچائی سے لے کر ٹھاکروں کے بیٹے کے ایک ہری جن بیوہ کی کٹیا سے نکلتے دیکھے جانے کی کہانی سناتے ہوئے آخر میں انہوں نے کہا ''بڑے مالک تینوں بڑے پوتوں کو کچھ زیادہ ہی پیٹ دیا آپ نے۔ شکایت کر رہے ہیں کہ ساما بھیا کو ایک لپڑ بھی نہیں جڑا۔ لڑکوں کے من میں میل آرہا ہے۔''

''ارے شیام نارائن کو ماریں گے تو دفعہ 201 لگ جائے گی اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ نہیں'' پھر اپنی ہی بات پر وبھوتی نارائن اپادھیائے اتنی زور سے ہنسے کہ سامنے مولسری کے درخت پر بیٹھا گوریوں کا جھنڈ بھرآمار کے اڑ گیا۔

اس دن اپادھیاؤں کے اس مشترکہ خاندان کے سب سے چھوٹے بیٹے کی بہو

سب سے چھوٹے پوتے کی ماں چھوٹکی پنڈتائن گھونگھٹ کے اندر آنسو پونچھ پونچھ کے خوب روئیں جب کہ ان کے بیٹے کو مار بھی نہیں پڑی تھی۔ دڈو کا دفعہ 201 لگنے والا مذاق لوگوں کو اتنا بھایا کہ اسکا تذکرہ کئی دن رہا۔ جتنی بار لوگ ہنستے وہ تلملا جاتیں۔ ان کا بیٹا اتنا کمزور کہ باپ دادا سرزنش کے لئے دو ہاتھ جھاڑ دیں تو مر ہی جائے۔ خوش حال پھیتیتی زمین جائداد والے خاندان مس ایسا قحط زدہ دکھائی دینے والا سوکھا مارا لڑکا وہ بھی دو لڑکیوں پر ایک اکیلا بھائی۔ پھر یہ کہ سوکھی لکڑی جیسے جلدی جل اٹھتی ہے ویسے ہی ذرا سے میں ناراض ہو کر دوسروں پر پل پڑیں اور مار کھا کے لوٹیں۔ لوگ چڑا چڑا کے مزا لیتے تھے پرانے وقتوں کی زمینداری نہیں رہ گئی تھی کہ لوگ خاندان کے نام سے کچھ زیادہ ہی خوف کھائیں اور دڈو اپنے دادا شری کی طرح جسے چاہیں پیڑ سے بندھوا کے پٹوا دیں۔

(ساما بھیا جب الہ آباد یونیورسٹی سے ہسٹری آنرز کرنے کے بعد شیام نارائن اپدھیائے آئی۔ پی۔ ایس بن کے لوٹے تو بھلے ہی دڈو نے گوشت خوروں کے لئے چار بکرے کٹوائے اور سبزی خوروں کے لئے کیسر بادام کی کھیر پوڑی تیار کرا کر جشن منایا ہو لیکن ڈومن حجام کی حیرت نے سب پر پانی پھیر دیا کہ ”ارے کپتان بن گئیں ساما پدھیا؟ ان کا تو ہم ہی اکھاڑے ماں چار بار پٹکے تھے۔“)

”ارے بُوبا سائیں کچھ تمہیں کرو نہ لڑکے لئے۔ یہ ایسا ہی رہ جائے گا کیا؟ چاروں بچا زاد ڈنڈ بیٹھک لگاتے ہیں ٹھاکر تک موہنہ لگتے ہوئے ڈرتے ہیں اور یہ پٹ آئے بھسکین نائی کے لڑکے ڈومن سے۔“

چھوٹی پنڈتائن نے بوبا سائیں کو ڈیوڑھی کے پچھواڑے والی بگیا کی طرف جو اکر دروازے کے پیچھے کھڑے ہو کر کلاوتی کہارن کی معرفت کہلوایا۔

”اچھا چھوٹی مکائن آج سے بوا ہمارے ذمے۔“ بُوبا سائیں نے پھلدار درختوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جنہوں نے کل بتیا کی وساطت نظر انداز کر کے آواز براہ راست اندر پہونچادی۔ بوا کو دراصل کچھ عرصہ پہلے ٹائیفائڈ ہوا تھا۔ بد احتیاطی کی وجہ سے پندرہ دن کے اندر دوبارہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے ہی پنپ نہیں سکے تھے۔ بالکل ہی

بقول بوبا سائیں پت لبھنگئے ہو گئے تھے۔ برہمنوں کے تین چار گھروں میں مرد گوشت کھاتے تھے۔ ان میں اپادھیائے گھرانہ بھی شامل تھا۔ کبھی کبھار بائی لگتی تھی محبوب سائیں ہی خصی خرید کرلاتے ذبح کر کے گوشت بھی بناتے۔ سری پائے اور دوسرا انگڑ کھنگڑ خود لے لیتے تھے گوشت پکانے میں دو دو خود کھڑے ہوتے جو گھر سے باہر پکتا اور وہیں کھایا بھی جاتا اس میں دو ایک خصوصی درجے والے مسلمان مرد بھی شریک ہوتے تھے۔ اس کے برتن گھر سے باہر گوشالہ کے قریب ایک ٹین کی چھت والے چھوٹے سے کمرے میں رکھے رہتے تھے۔ وہیں لکڑیاں اور اپلے بھی رکھے جاتے تھے۔ جب تک دادی حیات تھیں اس کمرے کی لکڑیاں اور اپلے تک گھر کی رسوئی میں نہیں آتے تھے ان کی موت کے بعد اتنی رعایت ہوگئی تھی کہ پورے گھر کی جلاون وہیں رہتی تھی برتن ایک کونے میں الگ رکھے رہتے یہ معلوم ہو کر کہ گھر کے بیشتر مردوں کو گوشت سے پرہیز نہیں تھا، ڈاکٹر نے شیام نارائن کے لئے چوزے کا شوربہ تجویز کیا تھا یہ تجویز ان کی والدہ نے سنی ان سنی کر دی اس لئے کہ اس میں جھنجھٹ بہت تھا اس کی جگہ وہ دودھ اور پھل کھلاتی رہتی تھیں جو صاحبزادے کو سخت ناپسند تھے۔ انہیں تو صبح شام چاٹ پکوڑے دیدو۔

بُوبا سائیں ایک اسٹوپ خرید کر لائے اور ایک المونیم کا ہینڈل والا چھوٹا برتن جو شہر میں سس پین کہلاتا ہے۔ ایک پلاسٹک کے ڈبے میں انہوں نے تیز پتہ، الائچی اور دار چینی جیسے خوشبودار مسالے اور ایک ڈبے میں نمک لا کر رکھا۔ اب وہ روز گھر سے ایک چوزہ ذبح کر کے لے آتے اور اس کی یخنی تیار کر دیتے تھے۔ ساما بھیا کو وہ شوربہ نہایت پسند آ گیا تھا۔ چوزے کی قیمت چھوٹکی پنڈتائن کبھی اناج اور کبھی نقد کی صورت دے دے دیا کرتی تھیں گرچہ بُوبا سائیں نہ کبھی مانگتے نہ وہ یہ کہہ کر دیتیں کہ یہ اس کی قیمت ہے۔ ادائیگی بھی روزانہ نہیں تھی۔ جب ان کا جی چاہتا دے دیتیں اور نہایت فراخ دلی کے ساتھ دیتیں کہ چوزے کی تو قیمت ہوتی ہے لیکن محبت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

ایک دن بُوبا سائیں کی اہلیہ حور بانو پنڈتائنوں سے ملنے ان کے گھر گئیں۔ بیٹھنے کو مچیا دی گئی، ڈلیا میں گڑ چبینا، اور تام چینی کے مگ میں چائے پیش کی گئی۔ تینوں خواتین نے

ان سے گھل مل کر حال چال پوچھا تو باتوں باتوں میں حور بانو نے کہا کہ چھوٹکے بھیا سب بھائیوں میں خوبصورت ہیں۔ پٹی داروں میں بھی کوئی اتنا سندر لڑکا نہیں ہے اس پر سے سانجھ دیکھیں نہ سویرا کبھی شمشان نکل گئے تو کبھی قبرستان۔ بے مدت گلی ڈنڈا کھیلتے ہیں تو گلی چھٹک کر کہاں جاتی، کس کو لگتی ہے کیا پتہ۔ سو بہتر ہوگا کہ دوا اور دعا اپنی جگہ لیکن ان کے گلے میں کچھ گنڈا تعویذ بھی ڈال دیا جائے۔ تینوں خواتین نے حامی بھری بلکہ دونوں بڑی چاچیوں نے یہ بھی کہا کہ تعویذ تو ان کے فرزندوں کے گلے میں بھی پڑنا چاہئے، جوان ہو رہے ہیں لوگوں کی نظریں تو رہتی ہی ہیں۔ او جھا کو بلا کر ایک آدھ بار جھڑوا یا تو جا چکا ہے۔ اور رہے سا ما بھیا تو ان کے لئے جب ٹائفائڈ ری لیپس ہوا تھا تب قاعدہ جاپ ہوا تھا۔ پھر بھی گلے میں کچھ مستقل طور پر پڑا رہے تو اچھا ہے۔

''تو ہم جائیں حاتم سائیں کے تکیے پر!''

اپنی ساس تو گذر گئی تھیں لیکن بیوہ چاچی ساس ابھی موجود تھیں۔ سن سفید، ہلتی ڈولتی وہ بھی بیٹھ گئی تھیں کہ حور بانو پورے گاؤں کی خبریں سنانے میں استاد تھیں خاص طور پر ٹھاکروں کے بیٹوں کے ہریجن ٹولہ کے چکر لگانے کی خبریں۔ حاتم سائیں کا نام سن کر تینوں بہوؤں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر نظریں گھر کی بزرگ کو تھما دیں۔ انہوں نے ہلتا سر کچھ اور ہلا دیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولیں چلی جانا حور بانو، تکیے سے تو پنڈ تانے کا پرانا ناطہ ہے۔ ہماری ساس کے وقت میں تو فصل کی پہلی چیز دیوتا کو بھوگ لگانے کے بعد تکیے پر ہی بھیجی جاتی تھی اس وقت حاتم سائیں کے دادا تکیے پر بیٹھتے تھے جو کہہ دیتے تھے سچ ہوتا تھا اب ایسے لوگ کہاں پھر بھی اثر تو ہے۔ پھر انہوں نے بہوؤں کی طرف دیکھ کر کہا، سوپ میں رکھ کر جوڑا اور بھیلی بھجوا دینا۔

دوسرے دن حور بانو سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹ کر سا ما بھیا کو لے کر بڑے سائیں کے تکیے پر گئیں۔ چار پانچ سائیں گلے میں منکے ڈالے آنکھوں میں سرمہ لگائے بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ مزار کے طاق میں چراغ روشن تھا۔ ایک پتلے گوٹے سے مزین غریبا مئو چادر پڑی ہوئی تھی۔ چادر پر سوکھے ہار پھول پڑے صاحب مزار کی کس مپرسی کی داستان

کہہ رہے تھے۔ حق اللہ بڑے سائیں نے پنڈتوں کے جانشین کو آتے دیکھ کر نعرہ بلند کیا۔ حور بانو نے بھیا کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ ایسے سوکھے مارے تھے کہ کچھ وزن ہی نہیں تھا مشکل سے چھ سات برس کے لگتے تھے اور ویسا ہی وزن تھا۔

سبھی فقیروں نے باری باری بچے کو پھونکا پھر ایک بار اجتماعی نعرہ بلند کیا حق اللہ اور چلم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ صرف بڑے سائیں تسبیح پھیر رہے تھے۔ پھیرتے پھیرتے بولے شام کو آکے تعویذ لے جانا محبوب محمد کی اہلیہ۔ جب حکم ہوگا تب ہی اتارا جائے گا۔ بے ادبی نہ ہو اس ہے اتار کر ندی میں ڈالا جائے گا۔ باقی دن جسم سے الگ نہ ہو۔

ساما بھیا چوزے کے شوربے، حاتم سائیں کے تکیے اور ڈاکٹر کے ٹانک کے مشترکہ اثر کے تحت اب خاصے صحت مند ہو گئے تھے اور کسرت بھی کرنے لگے تھے جو بوبا سائیں کی نگرانی میں بھیکن حجام کے اکھاڑے جا کر کی جاتی تھی۔

ساما بھیا نے دیر نہیں لگائی۔ اکھاڑے جانے کے لئے وہ ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ ان کا ایک خواب تھا، اپنے اوپر ہنسنے والے سبھی لوگوں کو کم از کم ایک پٹخنی ضرور دیں۔ اور جنہوں نے انہیں پٹخا انہیں تو اٹھنے ہی نہ دیں۔ اس خواب کے پورا ہونے کے آثار کچھ کچھ نظر آنے لگے تھے جس میں بوبا سائیں کی مدد شامل تھی۔ وہ بوبا سائیں کی جان نہیں چھوڑتے تھے۔

جب تک بھیا کسرت کر رہے تھے، بوبا سائیں بیٹھے ایک خط کا مفہوم پوری طرح ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خط ان کے ایک ننہالی رشتے دار نے دور دراز کے ایک گاؤں سے آنے والے شخص کی معرفت بھجوایا تھا۔ وہ اپنی لڑکی کا رشتہ سائیں کی بیٹی کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔

تبھی ساما بھیا ہانپتے کانپتے آ گئے۔ چلیں بوبا سائیں۔ انہوں نے بوبا سائیں کے شانوں کے اوپر سے سیاہ روشنائی سے بڑے بڑے حروف میں لکھی تحریر پر نظر ڈالی۔ انہیں وہ تحریر بہت مختلف لگی اور بہت دلچسپ بھی۔ وہ ہندی سے بالکل الگ تھی (انگریزی

سے بھی جو بس ابھی ان کے اسکول میں شروع کرائی ہی گئی تھی ) انہوں نے اس انوکھی تحریر کو غور سے دیکھا۔انہیں یاد آیا کہ ایک بار جب بوبا سائیں پنچسورہ پڑھ رہے تھے تب بھی ایسا ہی کچھ نظر آیا تھا۔ایسی تحریر جوان کے لئے نئی تھی۔

''یہ کیا ہے سائیں۔''

''چٹھی ہے بھیا۔''

''نہیں بوبا سائیں یہ لکھاوٹ کیسی ہے؟''

''یہ اردو ہے۔''

''اردو کیا ہوتا ہے؟''

''اردو اردو جیسے ہندی ہوتی ہے نہ بیٹا ویسے ہی ایک بھاشا ہوتی ہے۔''

''تم کو آتی ہے بوبا سائیں؟''

''آتی ہے۔

''اردو میں کچھ بول کر بتاؤ''۔

''وہی تو بول رہے ہیں''۔

''تم تو ہندی بول رہے ہو بوبا سائیں''

بوبا سائیں نے سر کھجایا۔اب کیسے سمجھائیں۔

''بتاؤ نہ بوبا سائیں۔ہم سے اردو میں پوچھو تمہارا نام کیا ہے؟''

''تمہارا نام کیا ہے؟ اب کیا ہے نہ بیٹا کہ اردو میں کہیں گے ایسے ہی مگر لکھیں گے دوسری طرح''

''اچھا تو لکھ کے دکھاؤ''

سائیں نے آس پاس پڑی ایک پتلی ڈنڈی اٹھائی۔اس سے کچی زمین پر لکھا ''تمہارا نام کیا ہے''

''بوبا سائیں ہمیں ایسے لکھنا سکھا دو۔اردو میں۔''

بوبا سائیں بے حد خوش ہو گئے،کسی نے ان سے پڑھنا سکھانے کی بات کی۔ان

کی زبان اردو سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اچھا دیکھیں گے۔

دو چار دن بعد ساما بھیا نے اپنی فرمائش دوہرائی تو وہ بولے۔ ضرور بھیا۔ چلئے ابھی شروع کرتے ہیں۔ پاس میں کاغذ پتر کچھ تھا نہیں۔ گیہوں کے شیڈ کے بغل میں چارے کی کوٹھری تھی۔ وہاں سے انہوں نے ہنسیا نکال کے پیپل کی ایک ٹہنی توڑی اور ہنسیہ سے ہی نوک بنائی پھر کچی زمین کی مٹی کرید کر ایک بڑا سا مستطیل بنا کر اس میں چھ خانے نکالے اور چھ عدد ابتدائی حروف تہجی لکھے۔ سوچا ایک بار میں چھ بہت ہیں۔ الف کو چھوڑ کر باقی سب ایک جیسے۔ صرف نقطوں کا پھیر بدل۔ ساما بھیا نہایت ذہین تھے۔ بہت جلدی سیکھ گئے۔ ڈنڈی کی نوک سے کچی مٹی میں نوکیلی شاخ سے لکھنے کا عمل بذات خود بہت دلچسپ تھا۔ اور یہ نئے حروف بہت دلچسپ انوکھے اور پرکشش تھے۔ تیسرے دن انہوں نے مٹی پر کی گئی مشق کو سلیٹ پر از خود دوہرایا اور خوشی خوشی سلیٹ لے کر بڑی چاچی کے پاس پہونچ گئے۔

چاچی دیکھو ہم نے کیا لکھا۔ الف، بے۔ پے۔ تے وہ مسرور لہجے میں بولے۔

کمر پہ ہاتھ رکھے بڑی دادی بھی ہلتی ڈولتی ادھر ہی آ رہی تھیں۔ انہوں نے آنکھیں بھینچ کر دیکھا۔ کیا ہے رے ساما؟

''ہمیں بوبا سائیں اردو لکھنا پڑھنا سکھا رہے ہیں۔''

بڑی پنڈتائن نے غور سے سلیٹ دیکھی۔ ان کا پورا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''ارے کل بتیا! جا، جا کے کہہ اس مرے سائیں سے۔۔۔ لڑکا کو ایکدمے مسلمان بنا دیہے کا☆''

☆ لڑکے کو ایکدم ہی مسلمان بنا دے گا کیا

# گئے وقت کا ملبہ

ابا ___ یہ چھوٹا سا، مختصر ترین لفظ عارف کے گلے میں ایک بڑا سا گولا بن کر پھنس گیا۔
ابا ___ اس نے بدقت تمام ہمت جمع کی۔
بڑی سی انگنائی ___ برآمدے کے کھمبے۔ ایک محراب میں ننھی میخ میں لٹکا مٹھو کا پنجرہ۔ یہ وہی مٹھو ہے کیا جو عارف نے پالا تھا اور اس کے گھر چھوڑنے کے وقت یہاں ٹنگا رہتا تھا اور جسے منو ماموں نے گالیاں سکھائی تھیں تو ابا نے سخت ناراض ہو کر اماں کے پورے خاندان کا بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیا تھا؟ لیکن طوطے کتنی بھی لمبی عمر پاتے ہوں چالیس برس تک تو نہیں جی سکتے۔ پھر کیا یہ سارا کچھ پتھر ہو گیا تھا؟ وقت کے اوپر منجمد؟ یا پھر دیواروں پر گئی گہرے سبز رنگ کی کائی کی موٹی پرت کے نیچے محفوظ جیسے برف کی تہوں میں لاشیں محفوظ رہ جاتی ہیں، اور جب صدیوں بلکہ قرنوں بعد برف پگھلتی ہے تو جسم ویسا کا ویسا نکلتا ہے جیسا کہ وہ تھا۔

ابا ___ آ ___ آواز دوڑتی چلی گئی۔ یہاں سے وہاں تک۔۔ گھر سے کوئی ایک فرلانگ دور بہتی گومتی کے پانی میں ہلوریں پڑیں۔ پل کے نیچے کتنا پانی گذر چکا تھا؟ ایک سمندر جتنا یا اس سے بھی کچھ زیادہ؟

تخت پر بچھی کثیف دری پر بیٹھے میلے کچیلے ابا نے گدلی آنکھیں پٹپٹائیں اور اپنا پوپلا موہنہ کھولا۔ بوڑھے پھونس ابا، جیسے سوکھی مچھلی، جیسے آم کی گٹھلی۔

کون؟ کون ہے؟ ان کی آواز میں کانپتی بے یقینی بالکل نمایاں تھی۔ کسی ایسی

روح کی بے یقینی اور بے چینی جیسے عالم برزخ میں صدیاں گذر چکی ہوں اور تب آج فیصلے کا دن آیا ہو کہ اسے جنت میں بھیجا جائے گا یا جہنم میں۔

''ابا۔ میں عارف ہوں۔'' عارف نے گلے میں پھنسے اس مہیب گولے کو نگل لیا تا کہ اس کی آواز آزاد ہو سکے۔ آواز جسے ابا پہچان سکیں۔

''عارف؟ کون عارف؟'' ابا کی آواز ہی نہیں ان کا پورا وجود تھر تھرانے لگا تھا اور پوپلا موہنہ پورا کا پورے کھل گیا تھا۔

''ابا۔ عارف میں۔ میں عارف آپ کا بیٹا ابا۔'' وہ اور قریب آیا اور اپنا ہاتھ ان کے شانے پر رکھ کر خود جیسے پتھر کا ہو گیا۔ اس نے جنرل سائنس کی کتاب میں کبھی پڑھا تھا کہ انسانی جسم میں پوری دو سو چھ ہڈیاں ہوتی ہیں۔ وہ ہڈیاں ایک مٹھی میں سما سکتی ہیں یہ تو اس نے کبھی نہیں پڑھا تھا۔ پھر ابا ایک مٹھی میں سمانے لائق کیسے ہو گئے تھے؟ اچھے خاصے لانبے، صحت مند، دبنگ آواز اور دبنگ شخصیت والے ابا۔ اس لق و دق آنگن میں اس بھرے پُرے مکان کی ویرانی میں جہاں کبھی بزرگ تھے اور جوان بھی بچے بھی تھے اور شیر خوار بھی، وہ ایک خالی صفحے پر لگا نقطہ تھے یا تپتے ریگ زار میں پانی کی لرزتی ایک بوند، بھاپ بن کر اڑ جانے کو تیار۔ آج اس نے ان گدلی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا جن سے آنکھیں ملانے کی ہمت وہ پہلے کبھی نہیں کر سکا تھا۔ وہ تو اماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں تکا کرتا تھا۔ کٹورا سی چھلکتی، بڑی بڑی روشن آنکھوں کو۔ مسکراہٹ جن میں جیسے ٹھہر گئی تھی جب عارف چھوٹا سا تھا۔

جب عارف چھوٹا سا تھا تب اماں بائیں شانے پر لٹکتی اپنی تازہ دھلے بالوں کی نم چوٹی کو پیچھے پھینکتی ایک طرف سے دودھ پلاتی، دوسرے ہاتھ سے اس کے گال میں ہولے سے گدگدی کرتی تھیں اور دادی انہیں ڈانٹا کرتی تھیں ''بہو، کیسی بیوقوف ہو تم، دودھ پیتے بچے کو گدگدی کرتی ہو۔ پھندا لگ جائے گا'' (اماں نے رضاعی مدت سے بھی کچھ زیادہ، کوئی تین برس تک عارف کو دودھ پلایا تھا اور عارف کو کبھی پھندا نہیں لگا تھا) وہ دادی کی بات سنی ان سنی کر جاتیں اور ملائم، ریشم جیسے بالوں کی بھیگی لٹ اس کے گالوں سے

چھواتیں۔

''پھنداپڑے نہ پڑے۔نظرضرورلگ جائے گی۔'' دادی پھر بڑبڑاتیں ''جتنی دیردودھ پیتا ہے،تم اس کا مونہہ تکتی رہتی ہو۔''

''میری نظر؟'' اماں کی نظروں میں ٹھہری مسکراہٹ باہر چھلک چھلک پڑتی۔'' ماں کی کہیں نظرلگتی ہے؟ماں کی تو دعاؤں کا سایہ ہوتا ہے اپنے بیٹے پر۔''

کم آمیز، کم سخن ، درشت مزاج ابا نے سارا کچھ سن سن کر ایک مرتبہ ہی اپنی کھر کھراتی آواز میں لقمہ دیا تھا ''جب دیکھو تب ماں کے ہی قصیدے سن لو۔باپ کی محبت،باپ کی دعاؤں کا تو سایہ جیسے ہوتا ہی نہیں ہے بیٹے پر ''

یہ سب عارف کو دادی نے بتایا تھا جب عارف چھوٹا ہوتے ہوئے بھی کچھ بڑا ہوگیا تھا اور دادی سے کہانی سنانے کی ضد کیا کرتا تھا۔جب بھی وہ دن میں کہانی سنانے کی ضد کرتا وہ ہرگز کہانی نہ سناتیں بس یہ باتیں لے کر بیٹھ جاتیں۔اس وقت کی باتیں جب وہ بالکل ننھا ساتھا اور چُس چُس اماں کا دودھ پیتا تھا یا اس وقت کی باتیں جب وہ پیدا نہیں ہوا تھا۔(تب اماں کے یہاں تیسری بار بھی بیٹی ہی پیدا ہوئی تھی آسیہ آپا عرف چھوٹی آپا تو دادی نے اماں کو وارننگ دی تھی کہ انہیں بس ایک موقعہ اور دیا جائے گا۔اگر اس بار بھی بیٹی ہی پیدا کی تو وہ اپنے بیٹے کی دوسری شادی کرائیں گی اور بہت کم مسکرانے والے ابا مونہہ پھیر کر مسکرائے تھے اور دادی نے اس مسکراہٹ کی صراحت یہ کہہ کر کی تھی کہ وہ دادی کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوئے تھے، ہوسکتا ہے دل ہی دل میں دعا کی ہو کہ اماں کے یہاں چوتھی زچگی میں بھی لڑکی پیدا ہو مگر اماں کا کہنا تھا کہ ابا اپنی والدہ کی حماقت کی وجہ سے مسکرائے تھے) جو بھی ہو ابا کی مسکراہٹ کا سبب مونالیزا کی مسکراہٹ کے سبب کی طرح راز ہی رہ گیا اس لئے کہ اگلی مرتبہ عارف پیدا ہوگیا تھا۔دادی دن میں کہانی اس لئے نہیں سناتی تھیں کہ ان کا کہنا تھا کہ دن میں کہانی سنائی جائے تو مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔اس لئے وہ دن میں جو کچھ سناتیں وہ کہانی نہیں تھی۔لیکن پھر عارف راستہ کیوں بھولا اپنے ہی گھر کا راستہ پورے پینتیس برس تک اسے یاد نہ آیا۔

کوئی گھنٹہ بھر پہلے وہ اپنی گلی کے مہانے پر آکھڑا ہوا تھا۔ پھر راستہ اس کے ذہن میں ان نقوش کی طرح اجاگر ہوا تھا جن پر جمی مٹی کو کسی نے برش لے کر جھاڑ دیا ہو۔ شاید ایسا اس لئے ہوا کہ اس کے سر پر اماں کی دعاؤں کا سایہ تھا (اور شاید ابا کی دعاؤں کا بھی جو کبھی دکھائی سنائی نہیں دیتی تھیں) اس لئے وہ بھولا تو سہی لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں۔

"آپ کسے ڈھونڈ رہے ہیں ؟"

نکڑ پر جگ رام داس حلوائی کی دوکان جوں کی توں موجود تھی۔ کڑاہ میں دودھ پینتیس برس سے کھول رہا تھا اور کناروں پر ملائی اکٹھا ہو رہی تھی۔ بس فرق اتنا سا آیا تھا کہ پہلے کھلے تھالوں پر مور چھل جھلتا جگ رام تھلتھلی توند لئے بیٹھا رہتا تھا اب جگ رام کے بیٹے نے شیشے کے خانوں میں مٹھائیاں رکھی تھیں تاکہ اسے مور چھل نہ جھلنا پڑے اور جگ رام کے بیٹے نے جس کی عمر عارف جیسی ہی تھی دھوتی کی جگہ پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ سڑک کے بعد گلی اتنی ہی تنگ تھی اور اس کا فرش اب بھی اینٹوں کا تھا۔ چھوٹے شہر انتہائی سست رفتار سے آگے بڑھتے ہیں پھر کیوں ٹھٹکا عارف؟ "آپ کس کو ڈھونڈتے ہیں؟"

سب کچھ ایسا ہی ہے تو کیا گلی محلے کے بچے اب بھی وہ کھیل کھیلتے ہیں؟

وہ دو پارٹیاں بناتے ہر پارٹی میں کوئی چار چار پانچ پانچ بچے۔ وہ ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ٹھمک ٹھمک کر آگے بڑھتے اور بڑی لے سے گاتے "تم کس کو ڈھونڈتے ہو، ڈھونڈتے ہو بڑی خوشی سے" پھر ویسے ہی ٹھمک ٹھمک کر پیچھے جگہ پر آجاتے اب دوسری پارٹی ٹھمکتی ہوئی آگے بڑھتی "ہم پھولوں کو ڈھونڈتے ہیں، ڈھونڈتے ہیں بڑی خوشی سے"۔

عارف بھی بچوں کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچتے مور کی چال چلتا یہ کھیل کھیلا کرتا تھا۔ کوئی چھ سات برس کی عمر تک لڑکیاں بھی لڑکوں کے ساتھ شامل ہوتی تھیں۔

"تم کس کو بھیجو گے، بھیجو گے، بڑی خوشی سے؟" تو کھیل میں اگلا سوال ہوتا

"ہم نمو کو بھیجیں گے، بھیجیں گے بڑی خوشی سے"

جسے بھیجا جاتا وہ چور بنتا اور کھیل آگے بڑھتا۔ نہ جانے کیوں ادبدا کے لوگ اس

موٹی سی گل گوتھنا لڑکی کو اکثر چور بنا کر بھیجا کرتے تھے۔ آگے چل کر اس نے تو عارف کا دل ہی چرالیا اس موٹے گالوں اور موٹی موٹی سیاہ آنکھوں والی لڑکی نے جس کی ماں اکثر عارف کے گھر میں گیہوں پھٹکنے اور دال دلنے کے لئے آیا کرتی تھی (تب پیکٹ میں بکنے والا مہنگی کمپنیوں کا آٹا دستیاب نہیں تھا اور اکثر ثابت دالیں گھر میں ہی دلی جاتی تھیں) اور کچھ اور کام بھی نمٹا دیا کرتی۔ اسے لوگ پٹھانن کہا کرتے تھے۔ گرمی کے موسم میں وہ بڑے سے تھرمس میں قلفی ڈال کر گھر گھر قلفی پہونچاتی (آئسکریم ابھی شہر میں عام نہیں ہوئی تھی)

عارف نے ضد باندھ لی تھی کہ شادی کرے گا تو نعیمہ عرف نمو عرف پٹھانن کی بیٹی سے۔ پٹھانن شوہر کے ذریعہ چھوڑ دیئے جانے کے بعد سخت محنت کرتے عزت آبرو کے ساتھ اپنا اور بیٹی کا پیٹ پال رہی تھی۔ سنر پنر کرتی چار گھر گھوم کے کام کرتی لیکن نعیمہ کو اس نے اسکول میں ڈال کر پڑھایا اور بری نظروں سے یوں چھپا کر رکھا جیسے مرغی چوزوں کو چھپا کر رکھتی ہے۔

ابا نے عارف کو دھکے مار کر گھر سے نکال دیا۔ انہوں نے اس کی شادی اپنی بہن کی بیٹی سے طے کر رکھی تھی۔ ابا دھکے نہ مارتے اور چھوٹے بڑے سب کے سامنے یوں ذلیل نہ کرتے تو بات اتنی نہ بگڑتی۔ عارف کے دل پر کہیں اتنی گہری چوٹ پہونچی کہ وہ گیا سو گیا۔ اماں کے آنسو بھی اس درد کا مداوا نہ کر سکے ویسے بھی ابا کون سا پیار جتایا کرتے تھے جب بھی بولتے اریب بولتے۔

''سو کے اٹھ گئے لاٹ صاحب۔ اب گھنٹہ بھر نہائیں گے اور مانگ پٹی جمائیں گے۔ امتحان سر پر ہیں۔''

''کمانے کی فکر کیسے ہوگی۔ باپ ہے نہ کولہو کے بیل کی طرح مشقت کرنے کے لئے۔''

''ایک ایک اینٹ جوڑ کے بنوایا گھر صاحبزادے ﷺ کے نہ کھا گئے تو میرے نام کا کتا پال لینا۔'' اکثر وہ دادی کو مخاطب کر کے کہتے ''تم نے اور تمہاری بہو نے ہی بھر کے بگاڑا ہے۔''

اچھے نمبر لانے پر کون سا گلے لگایا "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" بس یہی ستائش تھی ان کی۔ گریجویشن ختم ہوا تو بولے "ہوں۔ اب ایل ایل بی جوائن کرلو۔ اپنا بھلا کروگے میاں۔" لوگ کہتے تھے وہ بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ ہمیشہ اس کے مستقبل کے لئے فکرمند رہتے ہیں۔ بھانجی کو سلیقہ شعار اور پڑھائی لکھائی میں جی لگانے والا دیکھ کر اس سے خاموشی سے رشتہ بھی طے کرلیا تھا۔ خوبصورت تو خیر تھی ہی۔

آصف نے جس وقت گھر چھوڑا اس کا ایل ایل بی کا دوسرا سال مکمل نہیں ہوا تھا۔ شہر چھوٹا تو پڑھائی بھی چھوٹ گئی۔ اس نے چھوٹی موٹی نوکریاں کیں۔ بدقت تمام نامکمل تعلیم مکمل کی۔ پھر اس نے نعیمہ کو بلا کر اس سے نکاح کرلیا۔ لوگوں نے ماں بیٹی کا محلے میں رہنا دوبھر کر رکھا تھا۔ دونوں عورتیں اس کے برے دنوں میں چٹان کی طرح سینہ سپر رہیں۔ دکھ کٹ گئے۔ خوش حالی آئی بچے بھی ہوئے لیکن نہ ابا نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی نہ عارف نے پلٹ کر گھر اور کنبے کو پوچھا۔ شاید اماں یہ دکھ جھیل کر زندہ رہ گئی ہوتیں تو وہ واپس آنے کی سوچتا۔ یا کم از کم کچھ تعلق برقرار رکھنے کی کوشش کرتا (اماں کے انتقال کی خبر پٹھانن کے ایک رشتے دار نے پٹھانن کو بھجوائی تھی)

اماں میکہ سسرال دونوں طرف سے پکے وہابی مسلک کی تھیں لیکن کچھ مہینے گذر گئے اور عارف کی خیر خبر نہیں ملی تو وہ درگاہوں پر جانے لگیں، حتیٰ کہ ابا کے دوست بابو شیام نرائن ایڈووکیٹ کی بی بی سیتا دیوی کے کہنے پر ایک بابا سے ملنے بھی گئیں اور ان کی دی بھبھوت عارف کی تصویر کے نیچے دبا کر رکھی۔ بابا نے بتایا "آپ کا بیٹا پورب کی طرف گیا ہے۔ وہ خیریت سے ہے اور خوش ہے ایک دن ضرور واپس آئے گا۔" اماں نے بابا کو پانچ کلو مٹھائی کی ٹوکری دی جو انہوں نے فوراً غریبوں میں تقسیم کردی۔ ایک مولوی صاحب نے چالیس دن تک عمل پڑھنے کا وعدہ کیا۔ "یہ عمل کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ آپ کا بیٹا ضرور واپس آئے گا۔" اماں کان کی بالیاں اتار کر مولی صاحب کی بیٹی کے جہیز کے لئے دے آئیں اور ہمہ تن انتظار بن گئیں۔ پھر انتظار بلڈ پریشر بن کر ان کی رگوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ ایک دن دل کا دورہ پڑنے سے وہ چٹ پٹ ختم ہوگئیں۔ ابا ان کے سامنے کبھی راتوں کو اٹھ

اٹھ کر ٹہلتے نہیں تھے۔ نیند اڑ چکی تھی لیکن سونے کا بہانہ کئے پڑے رہتے۔ اماں کے جانے کے بعد کسی کا پردہ نہیں رہا۔ اکثر راتیں ٹہل ٹہل کے گذرتیں۔

تینوں بیٹیوں کی شادیاں ہوئیں۔ پھر عارف کے بعد والے سب سے چھوٹے آصف کی بھی۔ سب پھر پھر اڑتے چلے گئے۔ سبھی نے ابا کو اپنے ہاں بلا کے رکھنا چاہا۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ انہوں نے کسی سے نہیں بتایا کہ جب اماں نے کہا تھا کہ مولوی صاحب اور صوفی بابا دونوں نے کہا ہے کہ ایک دن وہ ضرور واپس آئے گا تو انہوں نے اماں کو بڑی زور سے ڈپٹ دیا تھا لیکن انہوں نے کسی سے یہ کبھی نہیں کہا کہ اگر واقعی عارف آ گیا تو؟ باہر تالا لگا دیکھ کے لوٹ نہیں جائے گا کیا؟ ان کے لئے محلے کی بڑی بی کافی تھیں۔ دونوں وقت کی روٹی ڈال دیتیں۔ ان کا بیٹا کپڑے دھو جاتا۔ جب وہ زیادہ بوڑھے ہو گئے تو دو لوٹا پانی ڈال کے دوسرے تیسرے نہلا بھی دیتا۔ وقت اور دل کی مار سے پچے، آم کی گٹھلی جیسے، سوکھی مچھلی جیسے ابا کے لئے صرف دو لوٹے اور دس منٹ ہی تو درکار تھے۔ وہ کبھی کہیں نہیں گئے۔ جس کا جی چاہا وہ ملنے یہیں آ گیا پھر یہ ملنے ملانے کے سلسلے بہت کم ہو گئے وقت اور فاصلوں اور مصروفیات کی دھول کی پرتیں موٹی ہونے لگیں۔ ابا اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے۔ ”میرے دو بیٹے تھے۔ میرے دو بیٹے تھے۔“

عارف کے شانے تھرتھرانے لگے۔ باسٹھ سالہ بوڑھا آنسوؤں پر قابو پانے کی بے پناہ کوشش میں جسم پر قابو کھو کر دھب سے وہیں بیٹھ گیا۔ ابا کی بغل میں۔ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے۔

”عارف کی ماں“ ابا اپنے آپ سے بولے۔ ”وہ آ گیا ہے۔ مولوی صاحب نے صحیح کہا تھا اور صوفی بابا نے بھی“ انہوں نے عارف کو اپنی استخوانی انگلیوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ چہرہ قریب لا کر گدلی آنکھوں کی دھندلاتی ہوئی روشنی میں اس کے چہرے کو دل میں اتارنے کی کوشش کی۔ یہ روشنی انہوں نے بچا کر رکھی تھی۔ ختم ہو گئی اور وہ آ گیا تو وہ اسے کیسے دیکھ پائیں گے۔ وہ مخبوط الحواس ہو چکے تھے لیکن انہوں نے اتنے حواس بچا کر رکھے تھے کہ اس کے کنبے کے افراد، اس کی زندگی اس کے کسب کے بارے میں پوچھ سکیں اور یہ جان کر کہ

اس کی زندگی اچھی گذری ہے اور اس کی اولاد بھی اچھی زندگی گذار رہی ہے طمانیت محسوس کر سکیں۔ ان کی خشک، استخوانی انگلیوں میں اتنا لمس بھی بچارہ گیا تھا کہ وہ اسے بار بار چھو کر اس کے وجود کا احساس کر سکیں اور خود کو یقین دلائیں کہ وہ گوشت و پوست کے بنے جسم کی صورت ایک بار ان کے پاس واپس آیا ہے۔ وہ واہمہ نہیں ہے۔

سب سے بڑی بات یہ کہ بڑھاپے سے سکڑتے دماغ اور سکڑتے دماغ کے سبب پیدا ہونے والے نسیان کے باوجود انہوں نے کہیں کچھ یادیں بڑے جتن سے اٹھا کر رکھی ہوئی تھیں۔

بڑی بی آئیں تو انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے گوشت کے لئے پیسے نکال کر دیے اور جگ رام داس حلوائی کے ہاں سے بالائی کا دونا بھی لانے کو کہا۔ کوئی عارف کے اندر زور سے رو اٹھا۔ اتنے برسوں کے بعد ابا کو یاد تھا کہ عارف بالائی بہت شوق سے کھاتا تھا اور کھانے میں گوشت نہ ہو تو ہنگامہ کر دیتا تھا۔ اب ان چیزوں کا مکمل پرہیز ہو چکا تھا لیکن اس نے اس کے متعلق ایک لفظ مونہہ سے نکالے بغیر بھرپور کھانا کھایا۔ ابا تو صرف پرول کے شوربے میں روٹی کا چھلکا ڈبو کر کھاتے رہے۔ اس کا مونہہ تکتے رہے اور شوربے میں سنی انگلیوں سے کبھی اس کی پشت کبھی چہرہ، کبھی بازو چھوتے رہے۔

کھانے کے بعد اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے رکھے اونگھنے لگے۔ بڑی بی پرانا گدا جھاڑ کے بستر لگانے لگیں

''میرا بستر الگ مت لگایئے میں ابا کے پاس سوؤں گا، تخت پہ۔''

''اے ہے میاں، تو شک تو لگا دوں۔''

ابا صرف دری پر سوتے تھے۔

''میں یہیں، ایسے ہی سو جاؤں گا، انہیں ڈسٹرب مت کریئے۔'' بڑی بی گدا واپس رکھ کے منڈیا ہلاتی چلی گئیں۔

تخت پر بیٹھ کر عارف نے ابا کو ٹھیک سے لٹا دیا پھر دیوار سے پیٹھ ٹکائی اور پیر پھیلا کر آنکھیں موند لیں۔ اماں دروازے کے پاس چق اٹھائے کھڑی دھکا دے کر نکالے

جاتے آصف کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ گھر میں مولوی صاحب گھوم رہے تھے اور ایک گورے چہرے پر قشقہ کھینچے پاکیزہ صورت والے موٹی بابا بھی جو لوگوں کو امیدوں پر زندہ رکھا کرتے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی گیا وقت لوٹانے کا اہل نہیں تھا۔

عارف کو بیٹھے بیٹھے ہی نیند آ گئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو محلے کی مسجد میں فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ ابا کا بازو اس کے کاندھے پر رکھا ہوا تھا اور گردن بے ڈھب طریقے سے ٹیڑھی ہو رہی تھی اس نے ہولے سے اسے ہٹایا تو ابا کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ سراسیمہ ہو کر اس نے سر سیدھا کیا تو دیکھا ان کی بے نور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ گئے وقت میں تحلیل ہو چکے تھے۔

# بکسا

امی ہمیشہ بکس کو بکسا کہا کرتی تھیں۔

بچے جب کم عمر تھے اور اسکول کی ابتدائی کلاسوں میں جایا کرتے تھے تو ایک بار بڑے بھیا نے انہیں ٹوکا تھا ''امی بوکس (box) کہا کرو، یہ بکسا کیا ہوا بھلا؟''

امی نے کہا ''بکس کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چلو کہہ لیا بکس۔ اب خوش!''

چھوٹی بڑی دونوں بیٹیوں نے بیک زبان کہا ''امی تم تو وہی کہا کرو 'بکسا' اب یہ بکس تو اور بھی۔ ''شاید وہ کہنا چاہتی تھیں دیہاتی، گنوار، نامانوس۔ ''لیکن رک گئی تھیں اس لئے کہ اب سے چالیس پینتالیس سال پہلے والدین اور بچوں کے درمیان حد ادب کچھ حد تک برقرار تھی۔

امی ہنسنے لگی تھیں ''ارے بھائی ہم تو بکسا ہی جانتے ہیں۔ وہ تو تمہیں خوش کرنے کو کہہ دیا تھا۔ اب یہ تمہاری طرح مونہہ پھیلا کے پھر اسے گول کرکے کون بولے بواو ۔۔۔کس۔''

وہ سب کے سب خوشگوار جاڑوں میں انگیٹھی کے گرد بیٹھ کر مونگ پھلیاں کھاتے، بھوبل میں شکر قندیاں بھننے کا انتظار کرتے، خوش دلی سے ہنسنے لگے تھے ''امی ذرا پھر سے تو کہنا بو ..او ..کس۔''

اور آج وہ سب امی کے بکسے کے گرد دائرہ بنائے اسی طرح بیٹھے تھے جیسے کبھی جاڑوں میں انگیٹھی یا تسلے میں جلتی آگ کے گرد بیٹھا کرتے تھے یا باورچی خانے میں پیڑھی

پیڑھیوں پر امی کی جھپا جھپ اترتی، باریک پھولی چپاتیوں کا اپنی اپنی رکابی میں باری باری تھپ سے رکھے جانے کا انتظار کرتے۔ پھر کوئی بچہ بیچ سے روٹی کی دو پرتیں الگ کر کے باریک پرت کو آنکھوں سے لگا کر دیکھتا کہ باہر دکھائی دے رہا ہے یا نہیں اور امی سے ڈانٹ سنتا ''کھانا کھا رہے ہو یا کھیل کر رہے ہو۔ چلو جلدی چھٹی کرو۔''

ابا کی کپڑوں کی دوکان تھی۔ وہ دوپہر کے کھانے کے لئے ذرا دیر سے آتے۔ امی بچوں کو کھلا لیتیں اور خود ان کا انتظار کرتیں۔ ان کے ہاتھ دھلاتیں، کھانے کے دوران دست بستہ کھڑی رہتیں۔ پھر دوبارہ ابا کے ہاتھ دھلا کر انہیں خلال دے کر برتن سمیٹتیں اور خود کھانے بیٹھتیں۔ اکثر ساڑھے چار بج جایا کرتے تھے۔ اکثر وہ رات کا کھانا برائے نام کھاتیں اس لئے کہ بقول ان کے دوپہر کا کھانا ابھی چھاتی پر دھرا ہوتا تھا۔

اس وقت وہ پانچوں ساتھ ساتھ تھے۔ اب دسوں دشاؤں سے گھوم کر آئے تھے۔ کوئی قریب سے کوئی دور سے۔ بڑی آپا نے بکس کھول رکھا تھا۔ اوسط سے بڑا پیتل کے قبضوں والا، امی کے جہیز میں ساتھ آیا بکس جسے وہ بکسا کہنے پر مصر رہا کرتی تھیں اور اب وہ گھر کی وہ واحد شئے تھا جو بلاشرکت غیرے امی کی کہی جا سکتی تھی ورنہ وہ اپنا سارا کچھ بانٹ چکی تھیں یہاں تک کہ اپنا وجود بھی۔ اس کی ظاہری صورت بڑی پراسراری تھی یا زمانے سے گزرنے کی وجہ سے ایسی ہو گئی تھی جیسے الف لیلہ کی کہانیوں سے نکل کر آیا ہو۔ پرانی چیزوں کا کوئی رسیا اس کے اچھے دام لگا سکتا تھا۔ نہ جانے پرانی ہو کر چیزیں زیادہ قیمتی کیوں ہو جاتی ہیں۔ بڑی آپا نے کہا تھا ''آؤ بھائی، سب لوگ بیٹھ جاؤ، پھر کوئی کچھ کہے نہیں۔''

''کیا کہے گا کوئی آپا؟'' چھوٹا بھائی قدرے جھنجلا کر بولا تھا۔ ''بلاوجہ کی بات۔''

''آج کل کسی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ کوئی کیا سوچ لے، پھر تم دونوں کی بیویاں نہیں آئی ہیں۔ اس لئے دونوں بھائی تو ضرور بیٹھیں۔'' منجھلی بہن نے بڑی کی طرف داری کی۔

''آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

بڑی آپا کی آنسوؤں سے لبریز بڑی بڑی آنکھیں جھپکیں۔ بسم اللہ کہہ کر انہوں نے کپڑوں کی پہلی تہہ اٹھائی۔ روزمرہ پہنے جانے والے پانچ چھ جوڑے تھے۔

کثرتِ استعمال سے قدرے پھیکے پڑتے ہوئے۔ درمیان میں سلیقے سے تہہ کئے ہوئے سفید دوپٹے رکھے ہوئے تھے۔ ابا کے انتقال کے بعد سے امی نے رنگین دوپٹے اوڑھنا بند کر دیے تھے گرچہ کپڑے ہلکے رنگوں والے پہن لیا کرتی تھیں لیکن دوپٹہ سفید ہی رہتا تھا۔ اب چونکہ رنگتی نہیں تھیں اس لئے کلف ڈال کر انہیں چننا بھی تقریباً بند ہو گیا تھا۔

کپڑوں کی ایک اور تہہ برآمد ہوئی۔

یہ سارے کے سارے بغیر سِلے جوڑے تھے۔ کبھی کوئی بیٹی دے گئی تھی۔ کبھی کوئی بیٹا۔ دو جوڑے آپا نے پہچانے یہ دونوں بھائیوں کی شادی پر ان کی سسرالوں سے آئے تھے۔

آپا نے ایک ایک کر کے انہیں الگ رکھا۔ کل سات جوڑے تھے۔ جب بھی بیٹا، بیٹی، بہو، کوئی آتا ان سے مطالبہ کرتا کہ وہ کچھ نئے کپڑے بنوالیں لیکن وہ کنی کاٹ جاتیں گرچہ اب کسی کفایت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''اب میرا کسی چیز کو جی نہیں چاہتا۔'' جب جواب میں یہ کہتیں تو ان کے لہجے میں ایسا کرب ہوتا تھا جو کہنے والے کے آس پاس دیر تک ٹھہرا رہتا۔

آپا نے پھر ڈبکی لگائی اور چوڑیوں کا کیس برآمد کیا جو بکسے کے کونے میں حفاظت کے خیال سے ایک پرانی چادر میں لپیٹ کر رکھا گیا تھا۔ خاصہ بڑا سا تھا۔

چوڑیاں امی کا واحد سنگار تھیں۔ شاید وہ واحد خرچ بھی جو وہ دو وقت کی روٹی اور سال میں دو جوڑے معمولی کپڑوں کے علاوہ اپنی ذات کے لئے روا رکھتی تھیں اپنے وقت سے جو سارا کا سارا دوسروں کے لئے تھا وہ کبھی کبھی تھوڑا سا اپنے لئے چرا کر ململ کے باریک سفید دوپٹے گھر پر خود رنگتیں ابرک اور کلف ڈال کر انہیں چنتیں اور ہم رنگ چوڑیاں ڈبے سے نکال کر پہنتیں۔ دن بھر کے سارے کاموں کے باوجود جن میں موسم کے مطابق ہاون دستے میں اچار کے مسالے کوٹنا بھی شامل تھا ان کی چوڑیاں جلدی ٹوٹتی نہیں تھیں۔ چوڑی ٹوٹنے کے لئے وہ ٹوٹنا لفظ کبھی استعمال بھی نہ کرتیں۔ کہتیں: ''چوڑی مول گئی'' ابا کے انتقال کے بعد امی کا چوڑی کا کیس نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس وقت تک تینوں لڑکیاں بیاہ کر کب کی جا چکی تھیں۔ اپنی اپنی زندگی میں مصروف۔ کسی کو زیادہ خیال تک نہ

آیا۔ آج برآمد ہوا تو پتہ چلا کہاں تھا۔ آپا نے ذرا کی ذرا ڈھکن اٹھایا تو جیسے پورے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ ایک عورت کے سہاگ کی روشنی۔ جگ مگ جگ مگ کرتی فیروز آباد کے شیشہ گروں کے خون پسینے کی روشنی۔

''ارے جلدی کرو نہ آپا، کیا بیٹھی چوڑیوں کو تک رہی ہو۔'' چھوٹا بھائی قدرے بے صبر ہوا اٹھا تھا۔

آپا نے بھائی کو گھور کر دیکھا اور تین کتابیں اٹھائیں۔ رضیہ کا شاہی دستر خوان، گھریلو نسخے اور ایک پنجسورہ۔ خاص خاص مواقع پر امی شاہی دستر خوان کی ترکیبیں آزماتیں۔ لڑکیوں کے بڑے ہونے پر ان کے لئے لڑکے والوں کا آنا اور شادی ہو جانے کے بعد دامادوں کی آمد و رفت خاص ہی نہیں، خاص الخاص موقعوں میں شامل تھے بڑے جتن سے ان مواقع کے لئے رقم پس انداز کر کے رکھا کرتی تھیں۔ ان کے بچت کرنے کے طریقوں میں گھر کے سارے کام خود کرنے حتیٰ کہ بچوں کے کپڑے اور شوہر کے کرتے پاجامے سینے، فصل پر سال بھر کا غلہ گاؤں سے منگا کر رکھنے کے علاوہ خود اپنی ذات پر کوئی خرچ روا نہ رکھنا ایک بڑا طریقہ تھا۔ کتنی تکلیف ہو خاموشی سے جھیل جاتیں۔ بس اٹھائی گھریلو نسخوں والی کتاب، باورچی خانے کے ڈبے ٹٹولے اور ہلدی، اجوائن، ادرک، پودینہ اور جانے کیا کیا، کوٹا چھانا یا پکایا اور اسی سے بقول ابا لوٹ پوٹ کے ٹھیک۔ بال بچوں والا ہو جانے کے بعد ایک بار بڑے بیٹے نے ہنس کر کہا تھا امی کے وقت میں بچوں کی طرح مرض بھی کم ڈھیٹ ہوا کرتے تھے۔ جلدی مان جاتے، وہ بھی معمولی چیزوں سے۔ اب مرض اینٹی بائیوٹکس کے بغیر نہیں سنتے اور بچے موبائل فون اور لیپ ٹاپ سے کم پر راضی نہیں ہوتے۔ اس طریق علاج اور دفعیات بلا میں ان کا پنجسورہ بھی تھا جو امی کے جہیز میں شامل تھا۔ اس کے غلاف پر سچا کام تھا جو انہوں نے خود بنایا تھا جب وہ کم عمر کنواری لڑکی تھیں۔ سلمٰی ستارے اب سیاہی مائل ہو گئے تھے اور جا پانی ساٹن جگہ جگہ سے مسکنے لگا تھا۔

''ہمارے وقت میں گھرانہ کتنا بھی دولت مند کیوں نہ ہو لڑکیوں کو کھانا پکانا اور سوئی سلائی کا کام ضرور سکھاتے تھے اس لئے کہ ہر ماں اپنی بیٹی کے لئے تشویش زدہ

رہا کرتی تھی۔ جانے کیسا گھر کیسا بر ملے۔"

گھر بر کے بارے میں تو والدین آج بھی تشویش میں مبتلا رہتے ہیں۔ لڑکیاں دستکاری سیکھیں یا نہ سیکھیں۔

امی کی شادی کے دو چار روز بعد ان کا چھوٹا بھائی پہلے پھیرے کی رخصتی کرانے آیا تھا۔ اس نے کچے آنگن والے کھپر پوش گھر پر کچھ کچھ پریشان نظریں ڈالیں تنہائی میں بہن سے بولا "آپا ایسے گھروں میں تو ہمارے یہاں مویشی باندھے جاتے ہیں۔ میاں نے کیا دیکھ کے۔ "امی نے اسے جملہ پورا نہیں کرنے دیا کس کر ہاتھ سے اس کا مونہہ دبا دیا "خبردار، آگے ایک لفظ مونہہ سے نہ نکلے۔ اور اگر گھر جا کر میاں سے کچھ کہا ہے تو میرا مرا مونہہ دیکھو گے۔"

"وہ کمینہ وسیم،" بھائی نے دانت پیس کر پہلے وقتوں کی حد ادب کا لحاظ کر کے کوئی گندی گالی نہیں بکی تھی پھر بھی شبنم جیسی امی نے شعلہ برساتی آنکھوں سے بھائی کو دیکھا۔ "گالیاں مونہہ سے نکالنا شریفوں کا شیوہ نہیں ہے اور وہ تمہارے سگے پھوپی زاد بھائی ہیں۔ آگے نہ سنوں۔" ان کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ بھائی پر ایک چپ لگ گئی اور وہ ہمیشہ چپ ہی رہا۔ امی کو کیسا گھر ملا تھا اور کیسا بر ان کے میکے میں کسی کو نہیں معلوم ہو سکا۔ یوں بھی لوگ بیٹی بیاہ کر اس کی قیمت پر شاکر ہو جایا کرتے تھے۔ شاید بہت سے تو اب بھی ہو جاتے ہیں۔ امی کی شادی بچپن میں ہی ان کے پھوپی زاد سے طے کر دی گئی تھی۔ پھوپی ٹکر کے گھرانے میں بیاہی تھیں۔ صاحبزادے اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیجے گئے تھے بزرگوں نے شادی کی تاریخ طے کرنے کی بات کی تو ساری ہمت یکجا کر کے انکار کر دیا۔ کسی لڑکی سے دل لگا بیٹھے تھے۔ امی کے والد نے جو میاں کہلاتے تھے چپ چپاتے دوسرے رشتے منگوائے "اچھا لڑکا" دیکھ کر لپ جھپ شادی طے کی اور جس مدت میں امی کی شادی متوقع تھی اسی مدت میں انہیں رخصت کر دیا۔

ابا یوں تو شریف تھے اور شریف صورت بھی لیکن نہایت گھنے۔ سوائے غصے کے اور کسی جذبے کا اظہار ان کے پاس نہیں تھا۔ ان پر غصے کا دورہ پڑتا تو امی سامنے سے ہٹ

جایا کرتیں۔ چیخ چلا چکتے تو ایک گلاس پانی پیش کرتیں، گرمیاں ہوتیں شربت لے آتیں۔ ایک مرتبہ اچھے موڈ میں تھے تو موقع غنیمت جان کر امی نے پنجسورہ کھول کر ان کی گود میں ڈال دیا۔ ''یہ دعا یاد کر لیجئے۔ غصہ آئے تو پڑھ لیا کیجئے۔ طبیعت کو سکون مل جائے گا'' ابا بڑی زور سے بھڑک گئے۔ بیوی یہ کہنے کی جراءت کر رہی تھی کہ وہ غصہ ور ہیں اور انہیں غصے پر قابو پانے کی نصیحت بھی کر رہی تھی۔ ایک ہاتھ مارا تو پنجسورہ دور جا پڑا۔ امی اس دن بہت روئیں۔ کلام اللہ کی بے حرمتی کے نتیجے میں ابا پر آنے والی متوقع آفت کے خوف نے انہیں دہشت زدہ کر دیا تھا۔ نفل نماز پڑھ کر اللہ سے انہیں معاف کر دینے کی دعائیں مانگیں۔

آپا کی آنکھوں سے آنسو دوبارہ رواں ہو گئے۔ وہ اس واقعہ کے وقت سمجھدار تھیں اور چشم دید گواہ۔ انھوں نے پنجسورہ پر محبت واحترام سے ہاتھ پھیرا پھر چوم کر الگ رکھ دیا۔

''وہ ادھر کیا ہے آپا۔ سبز رنگ کا؟ منجھلی نے بکسے میں جھانکا۔

''امی کا اندوختہ۔'' آپا نے ایک خوبصورت تھیلی برآمد کی۔ اس میں مڑے تڑے نوٹ اور کچھ ریزگاری تھی۔ آپا نے تھیلی گود میں الٹ لی۔ پانچ سو اسی روپے آٹھ آنے۔ اور ایک چھوٹی، چاندی کی بدرنگ ڈبیہ، اس کے اندر چار عدد چھوٹے چھوٹے زیور دو انگوٹھیاں اور ایک جوڑی ٹاپس۔ امی کو میکے سے بھاری بھاری زیور خاصی تعداد میں ملے تھے بچوں کی تعلیم اور پھر لڑکیوں کی شادی میں کام آئے۔ یہ باقی الصالحات میں تھے۔ شاید ایک سوواں حصہ۔ ایک چھوٹے پرزے پر لکھا ہوا تھا۔ ''میرے بعد انہیں بیچ کر اور جو روپیہ بکسے میں ہے اسے ملا کر گھر کی مرمت کر دی جائے۔'' آنسوؤں کی چلمن کے پیچھے سے دونوں بھائی ایک ساتھ ہنس پڑے۔ امی اس اندوختے سے تو تمہارے باورچی خانے کی چھت بھی نہ ڈھلے گی۔ کیوں تم نے سارے زیور بہو بیٹیوں میں بانٹ دیے۔ کوئی بڑا زیور رکھ لیا ہوتا۔

''چلو بھائی اٹھو، آپا ہو گیا نہ سب ختم۔''

تھوڑا بہت باقی تھا۔ کچھ بانس کی تیلیوں اور خوش رنگ کپڑوں سے ہاتھ سے بنائے گئے پنکھے تھے۔ جو ان دنوں کی یاد دلاتے تھے جب گھر میں بجلی نہیں تھی چھوٹے

چھوٹے بچے گرمی سے بے چین ہوتے تو امی رات بھر اٹھ اٹھ کر انہیں پنکھا جھل کر سلاتیں لگے ہاتھ ابا کو بھی جھل دیتیں۔ صبح نیند سے بوجھل آنکھیں لیے پھر گھر گرہستی میں جٹ جاتیں۔ تین چار ادھوری کشیدہ کاری کیے ہوئے میز پوش اور تکیے کے غلاف۔ ایک ادھورا بنا چکن کا کرتہ ایک مخملی جائے نماز جوان کے جہیز کی تھی۔ کثرت استعمال سے جگہ جگہ سے روئیں جھڑ گئے تھے۔ ڈر سے رکھ دی ہوگی کہ بالکل ہی جھیر جھیر نہ ہو جائے۔ لونگ الائچی کی کچھ پڑیاں شاید خوشبو کے لئے یا کیڑوں کو دور رکھنے کے لئے۔ ان سب کے نیچے کچھ کاغذ تھے۔ آپا قدرے متعجب ہوئیں۔ ٹٹولا تو دیکھا یہ ان سب کے اسکول کے ابتدائی دنوں کی کاپیوں سے پھاڑے گئے تھے۔ پانچوں بچوں کے الگ الگ۔ جب انہوں نے اردو اور انگریزی کے حروف تہجی لکھنا سیکھے تھے۔ گنتیاں اور، بالکل ابتدائی ریاضی کے ننھے ننھے سوال ٹیڑھی میڑھی تحریریں بورڈز کے پہلے امتحان کے ایڈمٹ کارڈ اور اسی طرح کی ان گنت یادیں۔

سب اٹھ چکے تھے۔ کون سا امی کے بکسے سے قارون کا خزانہ برآمد ہونا تھا۔

نئے کپڑوں میں سے کوئی چیز نشانی کے طور پر رکھنا چاہو تو تم لوگ رکھ لو باقی سب یتیم خانہ میں بھجوا دو۔ رقم بھی بھائی نے اٹھتے اٹھتے پکار کر کہا۔

آپا اب بھی وہیں بیٹھی رہ گئی تھیں۔

تہہ میں ایک دلائی تھی۔ آخری چیز۔ آپا کو اچھی طرح یاد تھی یہ دلائی۔ امی جاڑوں میں اسے اوڑھ کر کام کاج کرتی رہتی تھیں۔ نہایت نفیس، باریک ریشم کا کامدانی کیا ہوا دوپٹہ اوپر تھا اور پٹاپٹی کی گوٹ جو باریک پکی دھنک سے مزین تھی، امی کا صاف، گندمی رنگت کا چہرہ اس میں دمک اٹھتا تھا۔ پھر دوپٹہ مسکنے لگا تھا اندر سے روئی کی باریک ٹوٹی ٹوٹی تہہ جھلکنے لگی تھی۔ دھنک جگہ جگہ سے کھسک گئی تھی۔ امی نے اسے جہیز کی چند باقی بچی یادگاروں میں سے ایک سمجھ کر رکھ لیا ہوگا۔ وہی بکسے کی تہہ میں استر کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ باقی ساری چیزیں اس کے اوپر تھیں۔ آپا نے دلائی نکال کر اسے جھاڑا۔ تہوں میں سے نیم کی خشک پتیاں اڑ کر فرش پر بکھر گئیں۔ کسی خزاں زدہ درخت کے پیلے پتوں کی طرح ایک زرد پڑتی، چرمراتی، پرانی، تصویر بھی نکل کر اڑی اور پھڑ پھڑاتی ہوئی نیچے آگری یہ ایک نوجوان کی تصویر

تھی دھندلے پڑ جانے کے باوجود نقوش امی کی نوجوانی کی صورت سے کافی مشابہہ تھے۔
پھوپی، زاد ماموں زاد کے درمیان مشابہت کوئی حیرت کی بات تو نہیں تصویر کے پیچھے لکھے
گئے نام پر وقت سے اڑی گرد کی ایک موٹی تہہ جم گئی تھی۔شاید لکھا ہوا تھا 'وسیم'!

# منی آرڈر

گرمی کانٹوں بھرے جھاڑ کی طرح تن سے لپٹ لپٹ گئی تھی۔ ٹیبل فین کی ہوا صرف ایک رخ سے جسم پر لگ رہی تھی۔ باقی سب طرف وہی چن چن چن چن، ایکی اماں نے اپنی چوڑی چکلی چبوترہ جیسی پیٹھ پنکھے کی طرف کی۔ شاہدہ کو ملنے والی ہوا رکنے لگی۔ اس نے اماں کو کہنی سے ہلکا سا دھکا دیا۔ ''ارے بھیا پرے ہی رہو۔ ایک تو یونہی گرمی سے برا حال ہے۔'' اماں چڑچڑائیں۔ پنکھے کی ہوا کے لئے تینوں چھوٹے بھائی بہنوں میں الگ دھکا مکی ہو رہی تھی۔ ایک کونے میں پرانی چادر تہہ کر کے سعید نے اپنے لئے جگہ بنائی ہوئی تھی اور مطالعے میں غرق تھا۔ پسینہ اس کے چہرے سے دھاریں بن کر گر رہا تھا پریشانی چڑچڑاپن اور ناامیدی اس پسینے میں گھل مل گئے تھے اور ساتھ ساتھ ٹپک رہے تھے۔ تین دن بعد وہ سکریٹریٹ کے اسٹنٹ کے امتحان میں بیٹھ رہا تھا پچھلے دو امتحانوں میں ناکامیاب رہا تھا۔ ایک کسی بینک کا تھا اور دوسرا داروغہ کا اچانک وہ بڑے زور سے چلایا ''نکل جاؤ تم سب کے سب یہاں سے۔ کوئی پڑھنے نہیں دیتا ہے۔ دو سال پہلے تک گھر میں جب یہ پنکھا نہیں تھا تب کیسے گذرتی تھیں گرمیاں۔ اب بغیر بجلی کے پنکھے کے گذارا ہی نہیں لاٹ صاحبوں کا۔''

''تمہارا بھی تو گذارا نہیں بغیر پنکھے کے تم بھی تو پچھلے سے پچھلے سال جب بی کام کا امتحان دے رہے تھے تو ایک ہاتھ میں کتاب لے کر دوسرے ہاتھ سے تاڑ کا پنکھا گھماتے رہتے تھے۔ خود فضیحت اور دوسروں کو نصیحت'' شاہدہ کسی کٹ کھنی بلی کی طرح

غرائی اور اپنا بھاری ہوتا ہوا پیٹ لے کر دوسری طرف کو سرکنے کی کوشش میں پھر اماں سے ٹکرا گئی۔

''آپا تم تو زیادہ بولیو مت ''سعید نے موٹی سی گائڈ بک زور سے رکھی اور شاہدہ کو گھور کر دیکھا

''ہاں ہاں ہم کیوں بولیں گے۔ ہمارا حق تو اس گھر سے ختم ہی ہو گیا سمجھو۔'' وہ روانسی ہو گئی۔

''ارے تم پڑھ رہے ہو یا کٹ حجتی میں وقت ضائع کر رہے ہو۔'' ساتھ ہی اماں نے چھوٹی امت کو دھکا دیا۔ چلو نکلو۔ نکلو تم سب یہاں سے۔ بھاگو ''شاہدہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے بھائی تم بیٹھی رہو۔ تمہیں اٹھنے کو کسی نے نہیں کہا۔ بس خاموش رہو۔ لڑائی جھگڑے سے کیا فائدہ لڑکے کو پڑھنا ہے۔ ایک تو اللہ ماری گرمی۔'' کہتے ہوئے اماں پھر پنکھے کے آگے آ گئیں۔

''نہیں ہم نہیں بیٹھتے یہاں شاہدہ تنک کر برآمدے میں پڑے ڈھنگے تخت پر آ کر پھیل گئی اور دستی پنکھا اٹھالیا ہوا بالکل گم تھی۔ آنگن میں لگے امرود کے پیڑ کا پتہ بھی نہیں ہل رہا تھا۔ ایک شاخ سے ٹنگے پنجرے میں مٹھو پروں میں سر دیئے خاموش بیٹھا تھا۔ منڈیرے پر گوریا چونچ کھولے ہانپ رہی تھی۔

شاہدہ نے آنگن کی دھوپ سے وقت کا اندازہ لگایا۔ گھر کی واحد گھڑی سعید میاں کی کلائی کی گھڑی تھی۔ ان سے تو ابھی بات ہی نہیں کرنی تھی۔ ویسے بھی برسوں سے اس گھر کی خواتین آنگن کی دھوپ سے ہی وقت کا اندازہ لگاتی چلی آ رہی تھیں۔

آفتاب میں تمازت تو پوری تھی لیکن دھوپ دیوار کی طرف بڑھ چلی تھی یعنی کوئی چار بجنے کو ہوں گے۔

پوسٹ مین کے آنے کا وقت ابھی باقی ہے شاہدہ کا جی چاہا وہ سعید سے بالکل صحیح وقت پوچھے لیکن جی دبالیا۔

انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد ابا نے اوورٹائم کر کے سعید کے لئے ایک سستی سی رسٹ واچ خریدی تھی کچھ روپے اماں نے بھی ڈالے تھے۔ سعید کا کہنا تھا گھڑی نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے پرچے وقت پر نہیں ختم کر پاتا تھا۔ کبھی ایک سوال پورا چھوٹ جاتا، کبھی آدھا۔

اماں کے لئے وقت کو سمجھنے کی نہ فرصت تھی نہ اہمیت۔ سویرے اٹھ کر گھر کے کاموں میں سر جھکا کر، بیل کی طرح جت جاتیں۔ دوپہر میں کچھ دیر کمر سیدھی کرتیں پھر لیئی بنا کر پرانے اخباروں اور بھورے بانسی کاغذ کے لفافے بنانا شروع کرتیں۔ اسکول کی چھٹی ہوتی تو بچوں کو بھی ساتھ بٹھا لیتیں۔ انہیں کسی کام کے لئے گھڑی نہیں دیکھنی تھی۔ ان کے سارے کام جیسے کسی سانچے میں ڈھلے ہوئے چلتے چلے جاتے تھے اور وقت ریت کی طرح پھسلتا جاتا تھا سر سر سر سر دھکے دے دے کر اس نے گھر کا سارا پلاسٹر جھاڑ دیا تھا اور اماں کا بھی کسی دن بھر بھرا کر بیٹھ جائیں گی۔ وہ بھی اور گھر کی کچھ دیواریں بھی۔

''مارے گرمی کے کسی کام کو جی نہیں چاہ رہا '' وہ بڑبڑاتی ہوئی چھوٹے کمرے سے برآمد ہوئیں جہاں گھر کا واحد بجلی کا سامان یعنی وہ ٹیبل فین تھا جو شاہدہ کی شادی کے بعد نہ جانے کس تنگ و دو کے ساتھ کباڑی بازار سے خریدا گیا تھا۔ سعید پڑوس والے بجلی مستری کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ دوستی کا لحاظ کر کے اس نے پنکھا نہ صرف مفت میں ٹھیک کر دیا تھا بلکہ دو چار گر بھی سکھا دیئے تھے وقت بے وقت پھڑ پھڑا کر بیٹھ جاتا تو خود ہی کھول کھال کے دوبارہ رواں کر لیتے۔ یہ پنکھا بھی شدید دباؤ کے تحت خریدا گیا تھا عید میں پڑ رہی تھی سخت گرمی اور داماد پہلی عید میں گھر آ رہے تھے۔ اس پورے سال اماں نے رات کو بھی لفافے بنائے تھے اس کے اگلے سال بجٹ کو ہلانے والی کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن اس سال سعید کے امتحانوں کا چکر چلا۔ جگہ جگہ فیس فارم کی قیمت اور پھر کتابیں اس امتحان کے لئے یہ پڑھو اس کے لئے وہ پڑھو۔ پھر آ گئی شاہدہ۔

اچانک ان دونوں کو دیکھ کر اماں جیسے سناٹے میں آ گئیں۔ اگر انہیں کوئی خوشی ہوئی بھی ہوگی تو اس جلد اور اچانک آمد کے دھچکے تلے دب گئی تھی۔ بہت سی خوشیاں متوقع

اخراجات کے خدشے تلے دم توڑ دیتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی اس وقت بھی ہوا تھا۔ دو برس پہلے تک آخر شاہدہ اسی کنبے کا حصہ تھی لیکن اب آتی ہے تو لگتا ہے جیسے گھر میں ایک آدمی بڑھ گیا ہے۔ بڑھا ہوا خرچ صاف پتہ چلتا ہے۔ اس کے شوہر آجائیں تو اور مرے پہ سو درے اس مرتبہ بھی بیوی کو چھوڑنے آئے تو چار دن رہ گئے۔

"بیٹا کچھ پیسے ہیں؟ اماں نے دھیرے سے شاہدہ سے کہا، گوشت کے لئے کم پڑ رہے ہیں ابھی دے دو۔ دو چار دن میں خالہ کے پیسے آجائیں گے تو واپس کر دوں گی بیاہی بیٹی ہو تمہارا قرض نہیں رکھوں گی۔"

اماں کو امید تھی شاہدہ کہے گی اماں تمہارے اور میرے بیچ قرض کیا اصرار کر کے سو پچاس یونہی دے دے گی۔ لیکن شاہدہ نے جو جواب دیا اس کو سن کر وہ بہت دیر تک چپ رہ گئیں۔

"چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں اماں۔ اور جہاں تم نے بیاہا ہے وہ جھوٹی عزت والے لوگ ہیں۔ لفافے موم بتیاں بنانے نہیں دیتے اور اتنا دم ہے نہیں کہ مردوں کی کمائی سے خرچ پورا کر لیں۔"

پھر اس نے بعد میں اور تفصیلات بتائیں۔ دو بھائیوں کی تنخواہ سے مشترکہ کنبہ چلا کرتا تھا۔ بڑے بھائی جس محکمے میں تھے وہاں کئی مہینوں سے تنخواہ ہی نہیں ملی تھی۔ گھر میں فیصلہ ہوا کہ بہوؤں کو ان کے گھر پہونچا دیا جائے دونوں اپنی اپنی بیویوں کو ہنکا لائے۔ شاہدہ کو تو خاص طور پر اس لئے کہ وہ امید سے تھی۔ اماں مزید پریشان ہو گئیں۔ ابھی تو ابتدا ہی معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر تو کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اس پوری مدت کا خرچ اور پھر لین دین۔ شاہدہ نے ان کے چہرے پر پریشانی صاف پڑھی۔

شوہر رخصت ہونے لگے تو شاہدہ نے اماں کو سنا کر کہا "تنخواہ ملے تو کچھ روپیہ منی آرڈر کر دیجئے گا۔ اب سارا کچھ میرے والدین پر مت چھوڑ دیجئے گا۔"

وہ تھے نیک انسان۔ ایک اقلیتی ادارے میں اردو ٹیچر تھے۔ ایک تو گریڈ پورا نہیں ملتا تھا اور پھر مضمون ایسا کہ کوئی ٹیوشن بھی نہ پڑھے۔ بڑی کوشش کی تو کچھ دین دار

گھرانوں نے جن کے بچے کونونٹ اسکولوں میں پڑھ رہے تھے، انہیں عربی پڑھانے کے لئے لگالیا تھا۔

''اچھا'' انہوں نے بڑی فرماں برداری کے ساتھ جواب دیا اور سر جھکا کر رخصت ہوئے۔ بہت دنوں بعد پلاؤ کھایا تھا اور فیرنی بھی۔ یہ ذائقے ابھی زبان پر تازہ تھے۔

سنا ہے اکبر بادشاہ کے زمانے میں ایک دھوبی نے جمنا میں دور محل میں جلتی روشنی پر نظریں جما کر کڑکڑاتے جاڑوں میں کھڑے ہوکر رات گذار دی تھی۔ اماں کو بھی داماد کے سر جھکا کر 'اچھا' کہنے سے امید ہوگئی تھی کہ روپیہ آئے گا تو شاہدہ کا خرچ اٹھانے میں آسانی ہو جائے گی۔ دوادارو اور دوسری ضروریات شاہدہ خود پوری کرے گی۔ باقی وہ دیکھ لیں گی۔ ویسے انہوں نے زیادہ تیزی سے لفافے بنانے شروع کردیئے تھے۔ شاہدہ کی طبیعت اور موڈ صحیح ہوتے تو وہ بھی ساتھ دے لیتی تھی۔

چار ماہ گزر گئے ہر مہینے کے پہلے ہفتے شدید انتظار کیا جاتا منی آرڈر کا۔ دوسرے ہفتے ایک توقع رہ جاتی کہ شاید اب آجائے۔ تیسرے ہفتے یہ توقع مایوسی میں بدل جاتی اس لئے کہ تیسرے ہفتے سے تو اس گھر کی طرح اس گھر میں بھی بجٹ اور اہل خانہ کے درمیان رسہ کشی شروع ہوجایا کرتی تھی۔ پھر کہاں کی منی اور کہاں کا منی آرڈر۔ لیکن پھر مزید دن جاتے نیا مہینہ شروع ہوتا تو امید از سر نو جاگتی۔

''آپا'' سعید نے پرسوں کہا تھا۔'' ایک اور امتحان کے بارے میں اخبار میں نکلا ہے۔ پچاس روپے میں فارم ملے گا اور 125 روپے امتحان کی فیس۔ گھر میں کہا تو ڈانٹ پڑ جائے گی۔ تمہارا منی آرڈر آئے تو کم از کم فیس تم دے دینا۔ فارم کا انتظام کسی طرح کرلوں گا۔''

شاہدہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ غسل خانے میں رکھی صابن کی ٹکیہ گھس کر ختم ہو چکی تھی۔ وہ کئی دن سے بغیر صابن کے نہا رہی تھی۔ اماں سے کہا تو بولیں اب تو اگلے ہفتے ہی آئے گا جب پیسے ملیں گے۔ لفافوں کے پیسے ہفتے کے ہفتے آتے تھے۔ پھر کچھ توقف کے بعد کہا۔ تم صابن کو رورہی ہو یہاں والوں کے ڈبے ٹھن ٹھن کر رہے ہیں۔

صابن شاید میری وجہ سے قبل از وقت ختم ہو گیا۔ شاہدہ نے خود کو چور جیسا محسوس کیا۔ منی آرڈر آ جائے تو وہ صابن منگائے گی اور ٹانک جو لیڈی ڈاکٹر نے لکھا تھا۔ اسے کہا تھا بکرے کے پایوں کا شوربا پیو اور انڈا اور مونگ پھلی کھاؤ۔ خیر انڈا اور مونگ پھلی تو اماں نے منگوا دیے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دونوں چھوٹے بھائی بھی ٹوٹ پڑے۔ چھوٹے بچوں کا گھر ہو تو ایسی چیزیں اکیلے کیسے کھائی جا سکتی ہیں۔ منی آرڈر آئے تو وہ ٹانک کی شیشی خریدے ٹانک پر کوئی نہیں ٹوٹے گا۔ کبھی کبھار وہ پائے بھی منگایا کرے گی۔ اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ نہ جانے لڑکا ہے کہ لڑکی۔ اسے وہ کیا دے رہی ہے آگے بھی کیا دے سکے گی؟ چڑ کر اس نے سعید سے کہا "ابھی پیسے آ تو جائے قارون کا خزانہ۔ دیکھیں کتنا آتا ہے اور کس کس کے کون سے کام نکلتے ہیں۔"

آپا شادی سے پہلے اتنی کمینی تو نہیں تھیں۔ سعید نے دل ہی دل میں سوچا اور غصہ دباتا دوسری طرف کو چل دیا۔ ایک بار میری نوکری لگ جائے۔ سب کو دیکھ لوں گا۔

کسی نے دھیرے سے کنڈی کھڑکائی جیسے ہاتھوں میں جان نہ ہو مگر پنجرے میں ننگا طوطا پروں میں سے چونچ نکال کر گول گول آنکھیں گھماتا، پوری طرح چوکس ہو گیا۔ دوبارہ کنڈی ذرا زور سے کھڑکی تو وہ باقاعدہ گھوم گھوم کر چلانے لگا کون، کون ہے۔

ارے چپ کمبخت، دو مٹھی پر، ایک مٹھی ہڈیاں۔ بلی کا نوالہ اور آواز دیکھو جیسے صور اسرافیل۔ شاہدہ چونک کر اٹھ بیٹھی تھی۔ کیا پتہ ڈاکیہ ہو۔ یہ آگ برساتی دوپہر جیسے شنکر جی کی تیسری آنکھ کھل گئی ہو۔ ایسے میں کون گھر گھر گھوم سکتا ہے یا ڈاکیہ، یا لو یا پھر موت۔

ڈاکیہ ہی تھا۔ وہ جانی پہچانی آواز جو کبھی کبھار ہی سنائی پڑا کرتی تھی کہ اس گھر کے مکینوں کو خط لکھنے والے بھی بہت کم تھے سعید بھیا شاہدہ ننگے پیر بھاگی۔ طوطا ابھی تک چلا رہا تھا اس نے پنکھے کی ڈنڈی پنجرے پر ماری۔ ابھی سب اٹھ کر آ جائیں گے سب کو خبر ہو جائے گی منی آرڈر آ گیا۔ خبر تو ہونی ہی ہے لیکن شاہدہ یہ نہیں بتانا چاہے گی کہ کتنے روپے آئے۔ قبل اس کے کہ لوگ جاگیں وہ روپیہ جلدی سے گریبان میں اڑس لے گی۔ دروازہ کھولتے کھولتے اس نے دیکھا اماں باہر نکل آئی تھیں۔ ستیاناس۔ وہ جھنجھلائی

اور پوسٹ مین کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''چٹھی ہے بیٹا۔ ''پوسٹ مین نے کہا۔شاہدہ کے جسم اور ذہن کی پوری تیزی کے ساتھ گھومتی مشین پر جیسے کسی نے اچانک بریک لگا دیئے۔ مرے ہوئے ہاتھوں سے اس نے پوسٹ کارڈ سنبھالا۔اس کے شوہر نے لکھا تھا ''مجھے بہت افسوس ہے اس بار بھی میں منی آرڈر نہ بھیج سکا۔ ویسے تو تم اپنے والدین کے پاس ہو۔ وہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوگی۔ اگلے ماہ شاید بھائی صاحب کی تنخواہ جاری ہو جائے۔ تب تمہیں کچھ پیسے روانہ کروں گا۔

''کتنے روپے آئے آپا......؟''

سعید بھی باہر نکل آیا تھا اور پچھلا جھگڑا بھول کر پوچھ رہا تھا۔

شاہدہ نے پوسٹ کارڈ اس کے منہ پر پھینک دیا اور رونے لگی۔

# فاختہ

دادی کو اسے یوں مارتے ہوئے بہت افسوس ہو رہا تھا لیکن وہ بھی مجبور تھیں۔ کم بخت کسی طرح بول کیوں نہیں رہی تھی۔ آخر جب وہ اس طرح کی حرکت کر سکتی ہے تو یہ بتا بھی تو سکتی ہے کہ کس کے ساتھ مونہہ کالا کیا تھا۔

''ارے تو بولتی کیوں نہیں۔ بتا نہ کس کا ہے؟''

''کیا دادی؟''

دادی نے اب کے اس کے پیٹ پر ایک مکہ مارا۔''یہ۔ اور کیا۔''

''یہ۔۔۔ یہ تو ہمارا پیٹ ہے۔ یہ تو ہمارا ہی ہے۔'' اس نے بدقت تمام کہا اور درد سے دوہری ہو گئی

دادی نے سر پیٹ لیا۔ ایسے نہیں بتائے گی۔ شاید ان کے ہاتھوں میں زور نہیں رہ گیا ہے، مار ٹھیک سے پڑ نہیں رہی ہے۔ حالانکہ ابھی جو چہرے پر تھپڑ پڑا تھا تو وہ دوسری طرف کو جھول گئی تھی اور اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ مضبوط قد کاٹھی کی ادھیڑ عمر عورت کے لئے اس ذرا سی لڑکی کی بساط ایسی زیادہ تو نہیں تھی۔ ایک بے بس غصے کے تحت دادی کو رونا آنے لگا۔

کیوں مار رہی تھیں وہ اس بے ضرر، بے وقوف لڑکی کو۔ چودہ سال پورے ہو کے پندرہواں ہی تو لگا تھا یا شاید ابھی پندرہواں لگنے میں دو مہینے باقی تھے۔ انہوں نے انگلیوں پر حساب لگایا ہاں، دو مہینے ابھی باقی ہیں۔ غصے نے پھر ابال مارا۔ اس کم عمری میں ایسے

نازک، چھوٹے سے جسم میں ایسی آگ کہ پورے خاندان کی عزت دھڑ دھڑ کر کے جل اٹھے۔ابھی اس کے باپ کو تو پتہ ہی نہیں ورنہ جانے کیا آفت ہو۔

ایسے نہیں بولے گی۔ٹھہر۔وہ باورچی خانے میں گئیں۔شہر میں ہر جگہ تو گیس کا چولہا آ گیا ہے، کوئلے ہوتے تو آسانی ہوتی۔اب کیا کریں۔وہ رک کر مناسب تدبیر سوچنے لگیں۔ان کی بہو بھی ادھر ہی آ گئی تھی۔

''کچھ پھوٹی مونہہ سے؟''

''نہیں جی۔کاہے کو پھوٹے گی تمہاری لاڈلی۔''

''لاڈلی تو آپ ہی کی رہی ہے۔باقی سب تو دُور دُور پھٹ پھٹ ہی کرتے رہے ہیں۔'' بہو نے دل میں سوچا لیکن مونہہ سے نہیں بولی۔بچے جب بھی کوئی غلط کام کریں باپ بھی جھٹ سے اسے ماں کے ماتھے منڈھ دیتے ہیں اس وقت وہ باقی کسی کی اولاد نہ رہ کر اسی کی اولاد ہو جاتے ہیں۔

''پھر؟''

''دیکھتے ہیں۔'' ان کے لہجے میں غصہ،نفرت، بے بسی، مستقبل کا خوف، سب یوں گھل مل گئے تھے کہ ایک نیا بے نام جذبہ بن کر نکلا تھا۔

انہوں نے باورچی خانے کے ڈبے ٹٹول کر مرچیں نکالیں۔سوکھی لال مرچیں، بچھو کی دم کی طرح اینٹھی اور زہریلی۔ادھر اُدھر گھوم کر کچھ کاغذ اور دفتی کے ٹکڑے اکٹھے کیے۔دھاگے کا ایک خالی ریل بھی ان میں تھا۔یہ سب مروڑ کر ایک سخت گولا بنا کر بگھار کی چھوٹی کڑھائی میں رکھا اور اسے سلگا کر مٹھی بھر مرچیں ڈالیں۔پھر دھواں دیتی کڑھائی اٹھا کر لے چلیں۔وہ ساری مار بھول کر آستینوں سے خون آلود ناک پونچھتی کروشیا سے ادھوری بنائی ہوئی لیس اٹھا کر بننے میں مصروف ہو چکی تھی۔دادی کا دل بیٹھنے لگا۔

بہو کے یہاں شروع میں بیٹیاں ہی ہو رہی تھیں۔تین تین ہو چکی تھیں۔تب دادی نے پیر فقیر آزمانے شروع کیے۔ان کی پڑوسن اور گہری سہیلی نے جو دور دراز کی رشتہ دار بھی تھیں کہا پیر فقیر آزما لو لیکن اب کی جو لڑکی ہوئی تو بیٹے کے لئے دوسری عورت

دیکھنا۔لڑکیوں کی لائن لگتی جارہی ہے ادھر کاروبار پھیل رہا ہے۔اسے دیکھنے والا آنا چاہئے۔

دادی کی یہ دکھتی رگ تھی۔ بڑی جلدی تنک جایا کرتی تھیں۔ جلے کٹے لہجے میں بولیں ''ہاں دوسری جو آئے گی وہ تو لڑکے پیدا کرنے کا ٹھیکہ لے کے آئے گی۔'' ''ارے ہم نے یونہی کہہ دیا تھا'' وہ ہنس کے بولیں۔''اور کون لڑکی والا لڑکی لے کے بیٹھا ہی ہے کہ جھٹ سے چار بچوں کے باپ اور بیاہتا کے شوہر کو بیٹی دے دے گا۔ایک کام کرو۔اب کی ڈاکٹری معائنہ کرالو۔ایکسرے میں آجاتا ہے۔لڑکی ہو تو گروا دینا۔آخر کب تک لڑکا نہ ہوگا۔''

''ہاں یہ اچھا خیال ہے۔ہم بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہے تھے۔'' دادی پڑوسن کو اپنا ہم خیال پا کر خوش ہوگئیں اب کی بہو کا پاؤں بھاری ہو تو یہی کرنا ہے۔ سنتے ہیں پیسہ بہت لگتا ہے۔دیں گے دیں گے۔ بیٹا جو الگ سے ہمیں دیتا ہے وہ تو ہم جمع ہی کرتے رہتے ہیں۔کم ہوا تو اسی سے اور لے لیں گے۔مگر تم ساتھ چلنا۔''

''چلیں گے۔تمہارا بیٹا ہمارا بیٹا۔'' انھوں نے پاندان سے پان تما کو لے کے کھایا اور اٹھ گئیں۔

بہو کا پاؤں بھاری ہونے سے پہلے ہی دادی نے پیر فقیر درگاہ، سب کے یہاں حاضری دینی شروع کی۔در پر کوئی سوالی آجائے اسے بغیر دیے نہیں لوٹایا۔کئی تو ایسے مسٹنڈے تھے کہ ان کا ہاتھ پھیلا دیکھ کر جی جل کر خاک ہو جائے لیکن دادی نے بڑی محبت سے ان کی بھی جھولی بھر دی۔صحیح وقت آنے پر ڈاکٹر کے یہاں گئیں بہو کو لے کر۔تیوری پر بل ڈالے بغیر دو ہزار گن دیے۔معلوم ہوا اس بار لڑکا ہے،حمل گرانے کی ضرورت نہیں۔ خیر خوبی سے زچگی ہو جانے تک کسی نے مارے ڈر کے زیادہ خوشی کا اظہار بھی نہیں کیا کہ کہیں نظر نہ لگ جائے کہیں کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ پیر فقیر ویسے ہی مناتی رہیں۔جب تک جیتا جاگتا صحیح سلامت بچہ ہاتھ نہ آجائے تب تک کوئی خطرہ نہیں مول لینا۔کسی کو ناراض نہیں کرنا۔سب ٹھیک ٹھاک ہوگیا تو بچے کی ماں نے دبی زبان سے کہا کہ چار بچے ہو چکے ہیں اور اب تو بیٹا بھی آگیا آپریشن کرالیا جائے۔دادی ناراض ہوگئیں۔آپریشن کا تو نام بھی نہ لینا۔بچوں کا کوئی ٹھکانہ ہوتا ہے ننھی سی نازک جان۔ پل بڑھ جائے اور پھر یہ کہ ایک

بیٹا تو اور ہو۔ ایک بیٹا اور ہو جائے تو ٹھیک ہے آگے مت پیدا کرنا۔ دادی نے اپنی منتیں کم نہیں کیں۔ نہ خیر خیرات ٹونے ٹوٹکے چھوڑے۔ بچہ دو سال کا ہو گیا تو بہو کے پاؤں پھر بھاری ہوئے۔ دادی کو پختہ یقین تھا اس بار بھی بیٹا ہی ہو گا۔ ایسا پختہ یقین کہ انہوں نے اس بار ڈاکٹری جانچ بھی نہیں کرائی۔ اب بچے کی جنس کا پتہ لگانے کی فیس دوگنی ہو گئی تھی، کون بلا وجہ خرچ کرے۔ لے بھلا ہو۔ ہو گئی یہ بلا۔ موٹی، گل گوتھنا سی۔ ہر طرف سے ذرا چھوٹ سہتی تین سال کی ہو گئی۔ ماں چار بچوں میں مصروف رہتی۔ دادی پوتے کے آگے پیچھے پھرتیں۔ باپ اپنا پھیلتا بزنس مزید پھیلانے پر لگا رہتا۔ بڑی بہنیں اسکول جاتی تھیں۔ خیر، پل تو رہی تھی مگر تین برس کی ہو کر بھی بولنا نہیں شروع کیا تھا۔ نہ جانے کون ناراض ہو گیا تھا کون سی منت ادھوری رہ گئی تھی سوالی کی صورت کون گھر پر آیا تھا جو خالی ہاتھ لوٹ گیا تھا، کس عبادت میں کھنڈت پڑی جو لڑکی ہو گئی۔ اور ہو گئی تھی تو صحیح تو ہوتی۔ لوگ کہنے لگے تھے گونگی ہے۔ ایک تو لڑکی ذات اوپر سے اتنا بڑا نقص۔ بچے کھیلتے تو کنارے کھڑی ٹکر ٹکر دیکھتی۔ کھلکھلا کے ہنستی ضرور تھی۔ چڑیوں کو دانہ ڈالا جاتا تو پاس جا کے کھڑی ہو جاتی۔ کئی بار ماں کا پلو پکڑے پکڑے گھومتی اور ڈانٹ کھاتی۔ بھائی تو کئی بار چپتیا بھی دیتا لیکن اس کے موتہہ سے ایک لفظ نہ نکلتا۔ ماں کو دادی کو بس ایک تسلی تھی کہ بہری نہیں تھی۔ سن لیتی تھی۔ تین برس کی ہو گئی تو بھاگ بھاگ کے چیز اٹھا دیتی تھی۔ بھیا کی گیند، بہنوں کی پنسل کاپی، دادی کا چشمہ، ماں کا بلاوز، باپ کی چپلیں۔ چوتھا سال مکمل ہونے کو تھا اور لوگ پوری طرح مایوس ہو چکے تھے تبھی وہ معجزہ ہوا۔ اس نے پہلا لفظ موتہہ سے نکالا۔ اماں۔ زیادہ تر بچے پہلے ماں، اماں ہی بولتے ہیں اس لفظ میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ اس نے دادی کو اماں کہا تھا۔ اپنی ماں کو نہیں۔ دادی کے دل میں اس کے لئے شفقت کی لہر اٹدی۔ پھر سب نے راحت کی سانس بھی لی تھی کہ چلو گونگی تو نہیں ہے۔ دیر سے بولی لیکن بولی تو سہی۔ اب چل نکلے گی۔ ماں تو بہت آگے کی سوچتی رہتی اور بولتی رہتی تھی۔ گونگی سے شادی کون کرے گا، پڑھے گی کیسے۔ ہمیشہ گھر میں پڑی رہے گی۔ کسی نے شادی کی تو جہیز اتنا مانگے گا جو دیا نہ جا سکے۔ آخر پہلے بھی تو تین ہیں۔ وہ بولی تو ماں کا دل

کاموں میں زیادہ لگنے لگا۔ چلو اسکول جانے لگے گی شادی پر فضل پیسہ نہیں لگے گا۔ صورت؟ صورت تو اچھی ہی معلوم ہو رہی ہے۔

پانچ برس کی ہوئی تو اپنے مطلب کی باتیں کر لیتی تھی۔ دوسرے۔ جو کہتے وہ سمجھتی کم لیکن سمجھنے کی کوشش ضرور کرتی تھی۔ آنکھیں اور مونہہ دونوں پھیلا کر بات سنتی۔ بہری تو قطعی نہیں تھی پتا کھڑکتا تو بھی چوکنی ہو جاتی لیکن کوئی بات کرتا تو یوں مونہہ پھیلاتی جیسے قدرت نے اس کے کان مونہہ میں لگا دیے ہیں اور بڑی بڑی آنکھیں یوں اور بڑی کرتی جیسے بات اسے سنائی تو دیتی ہی ہے دکھائی بھی دینے لگتی ہے۔ آٹھ برس کی ہوتے وہ باؤلی کہلانے لگی تھی۔ پڑھنے بٹھایا گیا تو کبھی پڑھ کے نہ دیا۔ چوتھی جماعت میں دو بار فیل ہوئی تو سب نے صلاح کر کے اسے اسکول سے اٹھا لیا۔ کیا فائدہ تھا اس پر پیسے برباد کرنے کا۔ تینوں بڑی بہنیں اسکول جاتی تھیں۔ بھیا بھی جاتا تھا۔ یہ دن بھر باورچی خانے میں کھڑ پڑ کرتی رہتی۔ محلے پڑوس کے چار گھر گھوم کر چاچی، ماسی، دیدی، خالہ کے رشتے گانٹھتی دوسروں کے بھی کام کر آتی۔ گھر میں بڑا سا آنگن تھا۔ وہاں چڑیوں کو دانہ ڈالتی۔ فاختہ آتی تو سب سے زیادہ خوش اسی کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ جس دن فاختہ آ جاتی اس کے چہرے سے ہنسی شعاؤں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر گھر کو منور کرتی۔ وہ خود سے باتیں کرتی اور ہنستی۔

بے وقوفوں کی خاص پہچان ہے کہ بلاوجہ ہنستے رہتے ہیں۔

"اماں اس کا کیا ہوگا" بھائی نے تشویش کے ساتھ کہا

"اماں۔ اس باؤلی کو تو تم کسی اسپیشل اسکول میں بھجواؤ۔ پاپا سے بات کرو۔"

"جتنے میں اسے اسپیشل اسکول بھیجا جائے گا اتنے میں تو اس کا بیاہ ہو جائے گا۔" پاپا نے حساب لگا کے بتایا "ایسا اسکول یہاں نہیں ہے۔ ہاسٹل میں رکھنا ہوگا اور آتے جاتے رہنے کا خرچ الگ ہوگا۔"

"ارے ٹھیک تو ہے۔" دادی نے کہا۔ "ہم کون سے پڑھے لکھے تھے۔ تیری ماں بھی بس انٹر پاس ہے۔ ہم سب خوش ہیں گھر کے کام میں جی لگتا ہے۔ لڑکی کا سب سے بڑا گن تو یہی ہے۔ جہیز اسے باقی تینوں سے کچھ زیادہ دے دیں گے۔"

اس نے دادی کی منہ بولی بہن، جنہیں وہ چھوٹی دادی کہتی تھی کے گھر جا کران کی بہو سے کروشیا بننا سیکھا۔ اس کام میں اس کا ایسا جی لگا کہ وہ ہر وقت اس میں لگی رہنے لگی۔ کچھ ہی دنوں میں ایسا نفیس اور باریک کام بنانے لگی کہ لوگ حیرت زدہ رہ جاتے کوئی دس ایک سال کی لڑکی۔ دادی بہت خوش ہو گئیں۔ ماں بھی، بڑی بہنیں بھی۔ چلو باؤلی کو ایک ہنر تو آ گیا۔ رنگ برنگے دھاگوں کے ریل اور مختلف نمبروں کے کروشیا ہک منگا دیے گئے۔ نئے ڈیزائنوں کی کتابیں بھی۔ کچھ دن اور گذرے تو ایک اور نو جوان پڑوسن نے اسے ایک بوتیک چلانے والی خاتون سے ملا دیا۔ کروشیا کا کام بڑے زور و شور سے دوبارہ فیشن میں آیا تھا۔ وہ خاتون اسے مختلف کپڑوں میں کیا بنے گا، سمجھا دیتیں۔ باؤلی کی عقل جو کہیں نہ چلے یہ خوب سمجھ لیتی۔ سنہرے زری کے دھاگوں سے وہ بٹوے بناتی جو دلہنوں کے زرکار لباس کے ساتھ دیے جاتے اور نہ جانے کیا کیا۔ وہ باؤلی جس سے کسی کو کچھ امید نہیں تھی جس کی شادی کے لالے پڑتے ابھی سے دکھائی دے رہے تھے جس کے جہیز میں بھاری خرچ آنے کا ڈر تھا وہ گھر میں اچھی خاصی معقول آمدنی لانے لگی۔ اور ایسا از خود ہوا تھا۔ کسی نے سوچا نہیں تھا کہ لڑکی کو کچھ کام کرنا ہے۔

اس بیچ سب سے بڑی بہن خاصی انیس برس کی ہو کر بیسویں میں لگ چکی تھی اور بی اے پارٹ ون میں آ گئی تھی اس کے لئے اچھا لڑکا مل گیا۔ لڑکے والوں نے پڑھائی مکمل کرا دینے کا وعدہ کیا اس لئے شادی کر دی گئی۔ منجھلی بہن پڑھنے میں زیادہ تیز نکلی تھی اس کا ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا وہ سائنس سے انٹر میڈیٹ فائنل کر رہی تھی اور ساتھ ہی کوچنگ بھی جوائن کر چکی تھی۔ تیسری دسویں میں تھی اور اس سال بورڈز دینے والی تھی۔ بھیا کو پڑھنے کے لئے دوسرے شہر انگریزی اسکول بھیج دیا گیا تھا۔ باؤلی حیرت سے اپنے گرد و پیش گھومتی دنیا کو دیکھتی اور انگلیاں چلاتی رہتی۔ ریشم کے کیڑے کی طرح دھاگوں میں گھری، اپنے ہی خول میں بند وہ خواب کی طرح غیر یقینی اور تتلی کے پروں جیسی نازک جالیاں بناتی تھی۔

اچھی طرح پٹنے اور انگلیاں مروڑی جانے کے باوجود اس نے سنہرا زری کا دھاگہ اٹھا کر ایک سرخ دوپٹے میں آنچل بنا شروع کر دیا تھا۔ زرتار آنچل کہ یہ ایک دلہن کا دوپٹہ تھا جس کا جوڑا بوتیک میں بن رہا تھا۔

مرچوں کا دھواں ناک میں گیا تو وہ کھانسنے لگی لیکن نہ کروشیا رکھی نہ انگلی میں لپیٹا دھاگہ کھولا

''دادی۔ اسے ہٹاؤ۔'' اس نے دوسرے ہاتھ کو پنکھے کی طرح جھل کر دھواں ہٹایا اور تیز تیز سانسیں لیں۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔

''یہ تو اب تیرے مونہہ میں ٹھونسوں گی۔ بتا کس کے ساتھ مونہہ کالا کیا ہے۔ اور کب سے یہ چھنالا چل رہا تھا۔''

اس کی ماں بھی پیچھے آ گئی تھی اور اسے قہر آلود نظروں سے گھور رہی تھی۔

دادی نے دھواں اگلتی کڑھائی ٹھیک اس کی ناک کے نیچے لگا دی۔ ماں نے آنچل مونہہ پر رکھ لیا تھا۔

''دیکھ باؤلی اگر تیرے پاپا کو معلوم ہو گیا تو غضب ہو جائے گا۔ کاٹ کے پھینک دیں گے۔ بتا کون تھا وہ۔ پھر ہو سکا تو۔۔۔۔۔'' وہ کہنا چاہ رہی تھیں تیری شادی اس سے کرانے کی کوشش کریں گے شاید وہ اس لائق ہو۔

''مونہہ کالا۔ ہمارا مونہہ تو صاف ہے دادی'' اس نے ستھری آنکھیں اوپر اٹھائیں جو دھویں کی وجہ سے بھنچی جا رہی تھیں۔ پھر وہ کھانستے کھانستے بے دم ہو گئی اور اس کے بعد متلی کرتے کرتے۔ دلہن کا دوپٹہ اس نے گول گول لپیٹ کر لاپروائی سے پلنگ پر پھینک دیا تھا۔

ماں اور دادی دونوں نے بیک وقت اس کی پیٹھ پر، چھاتی پر، گالوں پر، جہاں پایا وہاں دوہتڑ رسید کئے اور پھر خود ہی دہاڑیں مار کر رونے لگیں جب کہ وہ باؤلی لڑکی خاموشی سے جا کر نل پر کلیاں کرنے اور مونہہ پر چھپاکے مارنے لگی تھی۔ اس کے ہر وقت خوش و خرم رہنے والے ذہن پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ آخر دادی اسے مار کیوں رہی تھیں۔

اور دادی مار رہی تھیں تو اماں تو کچھ بولتیں آخر اس نے کیا کیا تھا۔ اسے پھر ابکائی آئی۔ پیٹ بالکل خالی ہو چکا تھا خالی پیٹ کی ابکائی پیٹ کو ہی متھ کر رکھ دیتی ہے۔ اب آنتیں تو باہر آنے سے رہیں۔

''دادی کیوں رو رہی ہو؟'' اس نے مونہہ پونچھتے ہوئے واپس آکر اپنی حیرت بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

''اور اماں تم؟'' اب کی اماں کلیجہ پھاڑ کر رو پڑیں۔

بڑی بہن کے یہاں پہلوٹھی کا بچہ ہونے والا تھا۔ اس کی ساس دائم المریض تھیں۔ گھر میں کئی مرد تھے ایک شوہر، دوسرا سسر، تیسرا شوہر کا حقیقی چھوٹا بھائی اور ایک چچازاد بھائی بھی جو پڑھنے کی وجہ سے گاؤں سے شہر آکر اس کنبے کے ساتھ رہ رہا تھا۔ گھر میں اور کوئی کام دھام دیکھنے والا نہیں تھا۔ نوجوان، تندرست لڑکی تھی۔ سارا گھر نہایت خیر خوبی سے سنبھال رہی تھی اس لئے زچگی کے لئے اسے گھر جانے سے منع کر دیا گیا۔ لیکن بچہ ہونے کے وقت اور کچھ دن بعد تک تو اسے مدد چاہئے تھی۔ بعد میں بچہ بڑی بی سنبھال لیں گی۔

یہاں بھی کون تھا۔ دونوں لڑکیاں پڑھ رہی تھیں۔ دادی ضعیف تھیں۔ ماں پر پوری گرہستی تھی۔ ہاں ایک باؤلی ہی ایسی تھی جسے چھوڑا جا سکتا تھا۔ وہ نہایت خوش ہوگئی۔ ایک تو گھر سے کبھی کہیں باہر نہیں نکلی تھی دوسرے گھر کے کاموں میں اس کا خوب جی لگتا تھا۔ ایک ننھے بچے کو گود میں اٹھانے اور اس کے ساتھ کلکاریاں مارنے کا خیال بھی نہایت خوش آئند تھا۔ پڑوس والی دودو بھابیوں کے ننھے بچوں کو وہ گود میں اٹھاتی رہی تھی۔ ان کی پوپلی معصوم مسکراہٹوں میں اس کی اپنی بے ریا مسکراہٹیں یوں جھلکتی تھیں جیسے پانی میں پڑتا عکس۔ بہن کا بچہ تو اس کا اپنا بچہ ہوگا۔ اس کی عزیز بڑی بہن کا بچہ۔ وہ جب شادی کے لئے دلہن بنی تھی تو باؤلی کی بڑی بڑی ازلی حیرت زدہ آنکھیں اس سے ہٹتی ہی نہیں تھیں۔ اور جب رخصتی کے وقت باقی سب لوگ رو رہے تھے باؤلی کی حماقت بھری ہنسی سے سب ناراض ہوگئے تھے۔ کیسی احمق ہے کہ بہن جا رہی ہے تو یہ رونے کی بجائے ہنس رہی ہے۔

بھائی نے تو نظریں بچا کر اس کے سر پر ایک کراراچپت بھی رسید کر دیا تھا۔ باؤلی قدرا کا کام نہیں تھی کیسے سمجھاتی کہ کوئی لڑکی اتنی خوبصورت لگ رہی ہو تو اس کے اقربا کو چاہئے کہ بجائے رونے کے ہنسیں۔ دنیا اکثر ان لوگوں سے ناراض ہی رہتی ہے جن کے دلائل اس سے مختلف ہوں۔ ایسا نہ ہوتا تو نہ سقراط زہر پیتا نہ گلیلیو کو پھانسی ہوتی۔

بہن کے یہاں آ کر باؤلی بہت خوش ہوئی۔ اس کے گھر سے بھی بڑا گھر تھا۔ آنگن بھی تھا۔ ابھی اس شہر میں کثیر منزلہ عمارتیں کم تھیں۔ لوگ فلیٹوں میں کم اور گھروں میں زیادہ رہ رہے تھے اس لئے آنگن تھے تو دھوپ بھی تھی۔ کچھ پیڑ پودے تھے، ان پر چڑیاں آتی تھیں۔ بہن کے گھر کے پچھلے حصے میں تو اچھا خاصہ باغیچہ تھا۔ پیڑ سے لٹکتے امرود، موسمیاں اور نئے نئے مناظر، بہن لانبے لانبے بال کھول کر سنگار کرتی، سبز چوڑیاں پہنتی۔ اس کا پیٹ مٹکے جیسا بڑھ گیا تھا، لیکن پھر بھی وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ دلہن بن کر جیسی لگی تھی اس سے بھی زیادہ خوبصورت۔ باؤلی اسے تکتی رہتی۔ پیٹ اتنا بڑا ہو جائے مٹکے جیسا تو بھی کوئی اتنا اچھا لگ سکتا ہے؟

پھر اس پیٹ سے بہت پیارا ننھا سا گول مٹول بچہ برآمد ہوا۔ باؤلی تو نہال ہو گئی۔ خوش خوش سارا کام نمٹاتی۔ بڑی چابکدستی سے اس چودہ سال کی لڑکی نے سارا گھر سنبھال لیا تھا اور وہ گل گوتھنا بچہ بھی۔ اور بہن کا شوہر بھی۔

چھٹی نہا لینے کے بعد بہن نے لانبے لانبے بال کھول کر پورا سنگھار کیا تھا اور سنگار میز کے سامنے بیٹھی ہاتھوں میں چوڑیاں ڈال رہی تھی کہ اس کے شوہر نے آ کر اسے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا باؤلی آس پاس ہی تھی وہ یکلخت ڈر گئی۔ اسے محسوس ہوا شاید بہنوئی اس کی بہن سے کسی بات پر ناراض ہے لیکن اس نے دیکھا کہ بہن کھلکھلاتی ہوئی اس کے بازوؤں میں سما گئی اور سر شوہر کے سینے پر رکھ دیا ''ابھی کتنے دن اور صبر کرنا ہے'' شوہر نے کہا۔ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔ ''ایک مہینہ کم از کم'' بہن نے جواب دیا'' ارے باپ رے'' کہتے ہوئے شوہر نے اپنے چہرے سے اس کا چہرہ ڈھک لیا۔ ایسے منظر اس نے کئی بار دیکھے اور فاختہ کے پروں کی طرح ایک بڑا ملائم پیارا سا احساس ہر بار اس کے دل کو چھو گیا۔

شاید اسی لئے جب کسی نے ایک دن پیچھے سے آ کر اسے اپنے بازوؤں میں جکڑا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ تو ہونا ہی ہے۔ کھلکھلاتے ہوئے اس نے جکڑنے والے کے سینے پر اپنا سر ٹکا دیا۔ اور جب اس نے اپنے چہرے سے باؤلی کا چہرہ ڈھکا تو وہ سرور کی ایک نئی دنیا میں اترتی چلی گئی۔

بڑی نے جب باؤلی کو بلایا تھا تو گھر والوں سے کہا تھا کہ وہ اسے خاصے چھ، آٹھ مہینے تک روک لے گی۔ کوشش کرے گی کہ اس کی چھوٹی ہوئی پڑھائی بھی جاری کرا دے۔ لیکن چار پانچ ماہ ہی گذرے تھے کہ اسے اچانک یہ احساس ہوا کہ باؤلی کو جتنی جلد واپس بھیج دیا جائے اتنا بہتر ہے۔

کہیں گھر میں کسی اور نے وہ محسوس کر لیا جو وہ دیکھ رہی تھی تو پورے سسرال میں اس کے گھر کی عزت خاک میں مل جائے گی ساس کو طعنے دینے کے لئے ایک زیادہ دھاردار موضوع مل جائے گا اور کہیں شوہر کہہ بیٹھا کہ تمہاری بہن ایسی، تمہاری بہن ویسی۔ وہ بھی اتنی کم عمری میں تو تم پتہ نہیں کیا کیا گل کھلا کے ہمارے گھر آئی ہو گی تم تو چودہ سے پورے چھ برس زیادہ تھیں۔

ساس نے خدمت گذار لڑکی کے ابھی اور گھر میں ہی رہنے پر اصرار کیا تو اس نے کہا کہ باؤلی کی طبیعت ادھر ٹھیک نہیں رہ رہی ہے۔ بچے کو ہر وقت گود میں اٹھائے رکھتی ہے کہیں بچے پر اثر پڑ گیا تو؟ اور وہاں گھر پر بھی تو لوگوں کو اس کی خدمت کی ضرورت ہے۔ آخر بہن ہے نوکرانی نہیں۔ اسے واپس بھیجنا ضروری ہے۔

واپس آ کر باؤلی اپنی دھاگوں اور کروشیا کی دنیا میں دوبارہ مگن ہو گئی۔ وہ بے حد خوش تھی۔ بچہ یاد آتا تھا وہ گھر اور وہاں کا ماحول لوگ باگ لیکن یہ اس کی اپنی دنیا تھی اور وہ ایک خوش و خرم آسودہ روح تھی جسے ہر حال میں خوش رہنا آتا تھا۔ کروشیا سے ایک خوبصورت چیز مکمل ہوتی تو اس کے حسن اور تکمیل سے اس کا پورا چہرہ روشن روشن ہو جاتا۔

"باؤلی کہیں کی جب دیکھو تب دانت نکوسے رہتی ہے۔" لوگ کہتے۔

لیکن کوئی پندرہ دن میں گھر کی عورتوں نے محسوس کر لیا کہ باؤلی کتنی بھی خوش

دکھائی دے لیکن اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ جس طرح بھکوسی تھی اس طرح اب کھانا نہیں کھاتی، کھاتی ہے تو متلی کر دیتی ہے۔ کیاریوں سے مٹی اٹھا کر کھا لیتی ہے۔ وقت بے وقت سوئی پڑی رہتی ہے۔ تھوڑا تھوڑا پیٹ بڑھنے لگا ہے۔ دادی اور ماں اور ڈاکٹری کے لئے کوچنگ کرتی سائنس پڑھتی ہوئی بہن۔ لیکن سب نے کسی ان ہونی کے بارے میں سوچتے ہوئے ذہن کو جھٹک دیا۔ بہن نے کہا اماں اسے ڈاکٹر کو دکھاؤ اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔

ڈاکٹر نے کہا پیٹ میں کیڑے نہیں اسی کی طرح کا بچہ ہے۔ جیتا جاگتا۔ تیسرا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ تب سے باؤلی پٹ رہی تھی۔ دادی نے اس کی ماں یعنی اپنی بہو سے کہا کہ اگر گھر کے مالک یعنی باؤلی کے باپ کو پتہ چل گیا تو ایسا بھونچال آئے گا کہ سب تباہ ہو جائیں گے۔ بیٹی کا سسرال بھی۔

''تب؟'' باؤلی کی ماں نے سراسیمہ ہو کر پوچھا۔

''اسے گاؤں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں ہمارا چھوٹا بھائی ہے نہ۔''

''ماما کے پاس؟ لیکن وہاں۔۔۔۔۔۔''

''وہاں گاؤں میں ایک ہوشیار دائی ہے۔ جچگی تو کراتی ہی ہے۔ ایسے معاملے بھی نمٹائے ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔''

باؤلی نے اس بار مزاحمت کی۔ ماموں دادا کے یہاں جانا اسے قطعی پسند نہیں تھا۔ لیکن دادی اور اماں نے اسے باورچی خانے میں لے جا کر چمٹا تپا کر دکھایا۔

''اگر زیادہ بولی تو اسی سے مونہہ جلا دیں گے۔ چل ہم بھی ساتھ چل رہے ہیں۔''

دادی جا کر اسے بھائی کو سونپ آئیں۔ معاملہ اچھی طرح بھاوج کو سمجھا دیا تھا۔

دادی کا چھوٹا بھائی بھی پینسٹھ کی لپیٹ میں تھا۔ گھر میں بہو تھی۔ دو پوتیاں تھیں۔ دونوں بڑی ہو رہی تھیں۔ پوتے تھے۔ سب پر کیا اثر پڑے گا۔ بھاوج بے حد فکر مند ہو گئی۔ لیکن شوہر کی بڑی بہن کا معاملہ تھا۔ انہیں پھل، اناج، سبزیاں، دو سو ایک روپے گودی میں ڈال کر رخصت کیا اور وعدہ کیا کہ پریشان نہ ہوں۔ گھر کی عزت کا معاملہ ہے۔ سنبھال دیا جائے گا۔

''سنبھالنے'' کے لئے وہ آتے جاتے باولی کے پیٹ پر دو چار مکے جھاڑ دیتیں۔ کبھی ایک لات لگا دیتیں ۔ ان کی بہو اسے بھاری بھاری کام سونپتی۔ ایک بار بڑی ہوشیاری سے اسے دھکہ دے کر ٹیلے سے نیچے گرا بھی دیا۔ باولی کو بہت چوٹیں آئیں لیکن وہ ناک سڑکتی آنکھیں پونچھتی ویسی کی ویسی۔ اسے آئے پندرہ بیس دن ہو چلے تھے لوگ پریشان ہوتے جا رہے تھے اس کے پیٹ کا ابھار قدرے اور گول گول ہو گیا تھا۔

میاں بیوی نے مسکوٹ کی۔ پھولو کو بلا کر اس کے سپرد کر دیا جائے ؟ لیکن وہ زبان بند رکھنے کی بھاری قیمت طلب کرے گی اس کے بعد بھی کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں کچھ ضرور باہر آ جائے گا۔ گھر کے مالک مکھیا کا الیکشن لڑنے کی سوچ رہے تھے۔ کہیں جو اگر اس شاطر پھولو نے دونوں باتوں کو جوڑ لیا تو؟ گاؤں کے ایک سرپنچ کی عزت اس کے ہاتھوں نیلام ہو چکی تھی اور اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا اس لئے کہ پھولو کو ان کے دشمن نمبر ایک کی سرپرستی حاصل تھی۔

''پھر؟''

''پھر تو یہ کہ......''

''آپ کی بہن کو اعتراض ہوا اور سوال جواب ہو گئے تو.... ؟''

''بہن کہہ کر گئی ہے کہ لڑکی پوری طرح ہمارے حوالے ہے۔ جیسے جی چاہے جو جی چاہے کریں۔''

''سوچ لیجے''

''سوچ لیا ہے۔ بہو کو اچھی طرح سمجھا دو۔ اور سارا انتظام کر لو۔''

ایک ہفتے بعد باولی کو جاڑوں کی اس گہراتی شام میں باورچی خانے کے دروازے کے پاس رکھ دی گئی بڑی سی سل پر ارد کی دال پیسنے کے لئے بیٹھا دیا گیا۔ دوسرے دن دہی بڑے بننے تھے۔ چاروں طرف لالٹینیں جل چکی تھیں ۔ وائرنگ ہو جانے اور بجلی کے کھمبے نصب ہو جانے کے باوجود گاؤں میں بجلی شاذونادر ہی آتی تھی۔ شام ہوتے ہی سیار ہواں ہواں کرنے لگتے۔ اور الوؤں کی ہو ہو سنائی دیتی ''انڈیا شائننگ، انڈیا شائننگ''

(وہ سب انگریزی بولتے تھے۔)

چھوٹی دادی نے چراغ لاکر سل کے پاس رکھ دیا۔ باؤلی نے کہنی سے ماتھے پر آئی گھنے بالوں کی لٹ پیچھے سرکائی اور ہنس کر خوش دلی سے سیار کی نقل کی "ہواں ہواں ہواں حرامی کہیں کا۔ دن میں کھیت میں چگتی فاختہ کو پکڑ رہا تھا۔"

اچانک لپ جھپ آتی، دادی کی بہو کی ٹھوکر چراغ کو لگی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے واپس ہولیں اور باورچی خانے میں لگے ٹٹر کے دروازے کی بلائی بند کرتی ہوئی بندوق سے چھوٹی گولی کی طرح بھاگ نکلیں۔

باؤلی کی حیران آنکھوں میں کچھ زائد حیرانی نمودار ہوئی۔ پتہ نہیں کیا ہبڑ دبڑ ہو رہا ہے۔ اس نے گر کر بجھے چراغ اور پھیلے تیل میں لگی آگ سے خود کو بچاتے ہوئے اس پر پانی ڈالنا چاہا لیکن تبھی ارہر کے راٹھوں کے ڈھیر کا پاس رکھا مٹی کے تیل کا کین دھائیں، سے اڑا اور پہلے سے تیل میں بھگوئے ہوئے راٹھے دھو دھو کر کے جل اٹھے۔ جیسے 'مکھا گنی' کے بعد گھی سے شرابور کسی دولتمند مردے کی چتا۔

باورچی خانہ لیپنے کے بہانے دن ہی میں باؤلی سے سارے آٹے دال چاول کے کنستر، آلو پیاز، کے بورے اور دوسرا انگڑ کھنگڑ ہٹوالیا گیا تھا۔ بھینسال کی کھپریل کی مرمت کے لئے لائے گئے ارہر کے راٹھوں کا پورا ڈھیر وہاں ڈال دیا گیا تھا اور پھوس کا گٹھر بھی۔ سل ان کے پاس تھی یا وہ سب سل کے پاس رکھے گئے تھے۔

شنکر نے اپنی تیسری آنکھ کھولی۔

باؤلی نے آنکھیں پھیلا کر شعلوں کا تانڈو دیکھا پھر دال سے سنے ہاتھ اور جلتا جسم لئے چیختی ہوئی بے تحاشہ دوڑی۔ اس وقت اس کے پیٹ کے اندر کسی نے زور سے کروٹ بدلی پھر ایک ننھی سی لات ماری۔ بے چین ہو کر اس نے ایک ہاتھ پیٹ پر رکھا۔ لیکن تبھی بانس کا ٹٹر بھی جہنم زار بن چکا تھا جب تک وہ جل کر گرا وہ بھی پوری جل چکی تھی۔

لوگوں نے اسے پورا ٹائم دیا۔ جب اس کی چیخیں تھم گئیں تب واویلا شروع کی۔ باہر نکل کر چھاتی پیٹتے ہوئے پڑوسیوں کو پکارا۔

معمولی سے رونے دھونے کے بعد شہر سے آجانے والے سگے رشتے داروں نے وہ ساری ریتیں پوری کیں جو کسی کے مرنے کے بعد پوری کی جاتی ہیں۔ سب میں خبر پھیلی۔ باورچی خانے میں آگ لگ جانے سے وہاں کام کرتی باؤلی جل کر مرگئی۔ باؤلی بیٹی تھی بہو نہیں اس لئے کسی کے دل میں کوئی سوال بھی نہ پیدا ہوا۔ ہا، بے چاری۔ لوگوں نے کہا اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہوئے۔

لڑکی تھی مزے دار۔ گود میں کسی فاختہ کی طرح سمٹ آتی تھی۔ لیکن اچھا ہوا۔ کہیں جو اس احمق کے مونہہ سے اس کا نام نکل جاتا۔ یہ بول پڑتی کہ وہ کیا کرتا رہا تھا۔ اچھا ہوا جو لوگوں نے، اس کے اپنے لوگوں نے اس کی قسمت گڑھی۔

ہا، بے چاری! پھر وہ بھی اپنی زندگی میں مصروف ہو گیا۔ خوش و خرم اور بے فکر!

☆☆☆
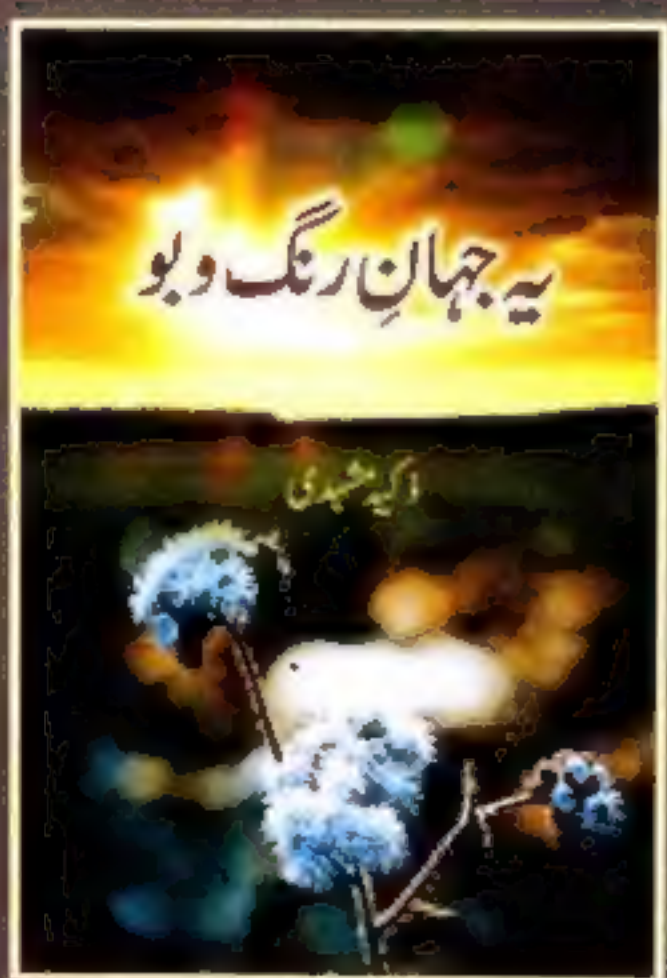
# YEH JAHAN-E-RANG-O-BU

(Short Stories)

by

*Zakia Mashhadi*

**EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE**
www.ephbooks.com

₹ 200.00